ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

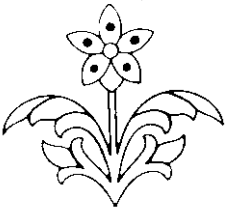

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲۔ ایمپرس روڈ۔ لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم۔

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)۔

جلد ۴ | فروری سنہ ۱۹۸۶ء بمطابق جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۶ھ | شمارہ ۱۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاھور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بیکری۔ شاہراہ لیاقت۔ کراچی (فون: ۲۱۶۵۹۶)

سالانہ زرِ تعاون۔/۳۰ روپے | فی شمارہ۔/۳ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

مضمون نگار حضرات کی آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں!

فہرست

• حکم و عبر ———————— ۳

چار اسباب: جو رشتہ ملّامیت کو کمزور کرنے کا باعث ہیں

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

• امیر تنظیم اسلامی کا پیش کردہ تصورِ فرائضِ دینی' ———— ۹

—— ایک جائزہ !

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

• سائنسی منہاج اور جدید فکر ———— ۱۷

ڈاکٹر ابصار احمد

• ہدایتُ القرآن (قسط ۶) ———— ۲۵

مولانا تقی امینی

• اسلام میں مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم ———— ۲۹

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

• سیرت و سوانح (۳) ———— ۵۱

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ

نصرت علی انیر

• مضاربت اور بلا سود بینکاری ———— ۵۹

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

تبصرہ کتب ———— ۶۵

حکمت و عبر

محمد سعید الرحمٰن علوی

چار اسباب:

جو رشتۂ اسلامیت کو کمزور کرنے کا باعث ہیں

گذشتہ صحبت میں ہم نے پاکستان کی تاریخ کے اس المیہ کا ذکر کیا تھا جو ۱۹۷۱ء میں پیش آیا اور دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کو بہا کر لے گیا۔

اس کے آخر میں "ایک صاحب نظر" کی ایک تحریر کے حوالے سے ہم نے چار اسباب کی نشاندہی کی تھی، جو سبب بنتے ہیں رشتہ اسلامیت کی کمزوری کا، حتٰی کہ بسا اوقات ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان اس "متاعِ عظیم" سے محرومی کے خطرہ کا شکار ہو جاتا ہے اور کفر و ضلالت اس کا مقدر ہو کر رہ جاتا ہے ـــــ اعاذنا اللہ تعالیٰ من ھذہ الحالۃ والکیفیۃ

قارئین کو یاد ہوگا کہ وہ اسباب تھے: مشرکانہ عقائد و اعمال، انتشار و افتراق، دولت کی بے پناہ محبت اور ہر قیمت پر اس کے حصول کا جذبہ اور جذباتیت:

ہم ان "اسباب چہارگانہ" کی تفصیل و تشریح کی خواہش رکھتے تھے لیکن "وسعت دل" کا مظاہرہ "وسعتِ صحرا" کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے اپنے خیالات و افکار کو گذشتہ صحبت میں چھوڑ دیا گیا تھا، کاغذی وعدہ نہیں قلبی وعدہ و احساس تھا، اس لئے آج اسی وعدہ کا ایفا کرنے کی کوشش ہے ـــــ

وباللہ توفیق!

پہلا سبب جو سامنے آیا وہ "مشرکانہ عقائد و اعمال" سے متعلق ہے، قارئین اس حقیقت سے خوب باخبر ہیں کہ شرک وہ گناہ ہے جس کی ارحم الراحمین اور غفور و رحیم ذات کے یہاں بھی قطعًا معافی نہیں ـــــ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو تعلق و محبت ہے اور مجرم سے مجرم انسان کے معاملہ میں بھی وہ جس طرح رحم و کرم کے دریا بہاتا ہے، اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، رسالت مآب محمد عربی صلوات اللہ تعالےٰ علیہ وسلامہٗ کے ارشاد کے مطابق ایسی خاتون جس کی زندگی "گناہ" میں گذری، اس کا چونکہ چراغ فطرت بجھا نہ تھا، اس لیے محض اتنی نیکی پر اس کو پروانہ بخشش مل گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس

بجھانے کا اہتمام کیا تھا ـــــ لیکن شرک ایسا جرم و گناہ ہے کہ ایسا رحیم و کریم آقا بھی حاکمانہ انداز میں اعلان کرتا ہے کہ جن کے دامن اس گناہ سے آلودہ ہوں گے اور جو اس حال میں دنیا سے رخصت ہوں گے، ان کی معافی نہ ہوگی۔ سورۂ نساء میں آیت ۴۸ اور ۱۱۶ میں اسی کا اعلان ہے بلکہ دونوں آیات کے ابتدائی الفاظ تک یکساں ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا جو اس کا شریک کرے اور شرک کے سوا کے دوسرے گناہ جسے چاہے بخشتا ہے۔

آیت ۴۸ کا آخری حصہ ہے:۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا

اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا ہی گناہ کیا۔

اور آیت ۱۱۶ کا آخری حصہ ہے:۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا

اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا وہ بڑی گمراہی میں جا پڑا۔

اس غیظ و غضب کا سبب بالکل ظاہر ہے اور یہ حضرت حق جل و علا مجدہ کی غیرت کا سوال و معاملہ ہے، بعض کتب میں دیکھا ہے کہ مشہور صوفی بایزید بسطامی قدس سرہ کے پاس ستر و حجاب کی پوری پابندی کے ساتھ ایک خاتون نے حاضر ہو کر شکایت کی کہ میرا خاوند دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، مجھے کوئی تعویذ و وظیفہ عنایت فرمائیں کہ وہ اس سے باز آجائے، ظاہر ہے کہ وہ متبع سنت شیخ و رہنمائے طریقت تھے عورتوں کی مجالس، تعویذوں کا کاروبار اور نذرانوں کی بھیڑ ان کے یہاں نہ تھی، اس لئے اسے فرمایا "بی بی! اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے چار تک کی اجازت ہے تو پھر؟ اس نیک بخت خاتون نے عرض کیا کہ شریعت کی اجازت ہوتی اور میں اپنا ستر و حجاب اٹھاتی تو آپ میرے حسن و جمال کو دیکھ کر فیصلہ میرے حق میں کرتے کہ اس حسن میں سوکنا پا درست نہیں۔" شیخ وقت" اس کی بات سے گہرے تاثر میں ڈوب گئے اور پھر فرمایا: "توحید پر ایمان تو الحمد للہ تھا، لیکن اس عورت نے تو عجیب بات سمجھا دی، اس بیچاری کا حسن عطائی بھی ہے اور عارضی بھی، لیکن سوکنا پا اور شریک اسے گوارا نہیں تو حضرت حق جل و علا مجدہٗ جو خالقِ حسن ہیں اور جن کا حسن ذاتی ہے (اَللّٰهُ جَمِيْلٌ) وہ اپنا شریک کس طرح گوارا کریں؟

حضور اکرم قائد الاعظم والاطہر صلوات اللہ تعالیٰ علیہ و سلامہٗ نے اسی طرف اشارہ کیا:۔

"کہ میں تم سب سے زیادہ غیرت مند ہوں اور میرا رب مجھ سے بھی زیادہ"
دین کے حوالہ سے غیرت بیش قیمت سرمایہ اور انسان کی شدید ضرورت ہے اور یہ رخصت ہوتی ہے تو بہت کچھ رخصت ہو جاتا ہے ۔

؎ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

خاتم الانبیاء والمعصومین علیہ السلام بعض لوگوں کی خواہش سجدہ پر ایک لمحہ کی اجازت نہیں دیتے اور فرماتے ہیں :

اُعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَاكْرِمُوا اَخَاكُمْ

عبادت تو صرف تمہارے رب کا حق ہے' اسی کی کرو' اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارا بڑا بنایا ہے تو اس حوالہ سے اکرام و احترام ضرور چاہیئے ______

اور ایک دوسرے موقعہ پر سجدہ کی بات آئی تو فرمایا کہ اس دھرتی پہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیئے ایسا ممکن ہوتا اور اس کی اجازت ہوتی تو بیوی کو خاوند کے سجدے کا حکم دیتا ۔

مزید دیکھیں کہ سرورِ عالم و عالمیان علیہ الصلوٰۃ والسّلام ، بقول ام المؤمنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ، دنیا سے پردہ فرماتے ہوئے ، آخر میں جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں اس میں یہود و نصاریٰ کے مستحق لعنت ہونے کا ذکر ہے اور فرماتے ہیں کہ ایسا اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ______ میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا ۔

لیکن اس ساری صورت حال اور احکامات و ہدایات اور اسلام کے سانچہ و عمارت میں "عقیدۂ توحید" کی کلیدی و بنیادی اہمیت کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیں' اور اپنے حالات کی تصویر سامنے لائیں ۔

وطن عزیز میں بزرگان دین اور اکابر اولیاء کرام ، اور بعض قومی رہنماؤں کی قبروں کو جو مقام امت کی بڑی اکثریت نے دے رکھا ہے' حکومتی طبقے ، اہل حل و عقد' بعض علماء و صوفیاء اور عوام کی بڑی تعداد وہاں جو کچھ کرتی ہے' اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں " قطب البلاد لاہور " میں آرام فرما شیخ و عالم ربانی حضرت السید علی ہجویری قدس سرہٗ کے مزار سے لے کر فلاں فلاں جیسے حقائق دین سے ناآشنا' سنّتِ رسولؐ سے محروم ، برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق ______ پیرانِ عظام و اکابرین ملت (؟) کی قبریں یہ روپ دھار چکی ہیں کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک توہم پرست اور کج رو افراد طواف و سجدہ میں مشغول رہتے ہیں لیکن کسی حاکم و مقتدر اور کسی پیر و عالم کو اس پر ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ حاکمانِ وقت' اپنے اقتدار کے استحکام کی خاطر خود اس بھیڑ چال میں آ شریک ہوتے ہیں ۔ بہشتی دروازوں کو

کھولتے، چادریں چڑھاتے، قبروں کو غسل دیتے، ان پر قبے اور عمارات بناتے اور ان پر عود و اگربتی سلگاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ نے ان میں سے ہر چیز سے روکا، انہیں کھلے ہوئے مشرکانہ اعمال سے تعبیر کیا ـــــ ہر روز اخبارات و رسائل میں ایسی ان گنت تحریریں چھپتی ہیں جن سے عقیدہ توحید متاثر ہوتا ہے، نہیں بلکہ مجروح ہوتا ہے، ریڈیو، ٹی وی سے اس قسم کی خرافات نشر ہوتی ہیں، لیکن کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی، وہ "حاکمانِ وقت" جو اپنے "اُجلے دامن" پہ ذرا سا "داغ" برداشت نہیں کرتے اور ہر "بندہ گستاخ" کو بتائے بغیر اس کی آزادی سلب کر کے اس کے گھر کو ہی جیل بنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے معصوم بچوں اور خواتین خانہ تک کی پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں، ان کی نگاہ میں عقیدۂ توحید کی اتنی بھی وقعت نہیں کہ وہ ان اعمال و افعال، ان تحریرات اور ان پروگراموں پر قدغن لگا سکیں اور احساس کر سکیں کہ انہیں ایک دن "داورِ محشر کی عدالت میں حاضر ہو کر اس کا بھی حساب دینا ہے کہ "نہی عن المنکر" کے معاملہ میں انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا یا نہیں؟ ستم یہ ہے کہ ہماری نصابی کتابیں اس قسم کی خرافات سے پر ہیں، گذشتہ دنوں "فاضل اردو" کی تیاری کرنے والے ایک دوست سے ملاقات کے موقعہ پر ان کے کورس کی دو کتابوں "مثنوی سحرالبیان" اور "مثنوی گلزارِ نسیم" کو سرسری طور پہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے اوّل الذکر "میر حسن دہلوی" کا کلام ہے تو دوسری "پنڈت دیاشنکر نسیم" کا۔

چند اشعار ان سے ملاحظہ فرمائیں جن سے عقیدۂ توحید و رسالت، عصمت انبیاء اور نہ معلوم کس کس پر ضرب لگتی ہے:

صغیرہ کبیرہ سے یہ پاک ہیں ۔۔۔ حساب عمل سے یہ بیباک ہیں
علی سے لگا تا بہ مہدیؑ دیں ۔۔۔ یہ ہیں ایک نور خدائے بریں
انہیں سے ہے قائم امامت کا گھر ۔۔۔ کہ بارہ ستوں ہیں یہ اثنا عشر!
نہیں ہمسر اسکا حضور علیہ السلام کو کوئی جز علی ۔۔۔ کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی
خضر اس کی سرکار کا آب دار ۔۔۔ زرہ ساز داؤد سے واں ہزار
خلیل اس کے گلزار کا باغباں ۔۔۔ سلیمان سے مہر دار اس کے ہاں

یہ جملہ اشعار مثنوی سحر البیان کے ہیں، شروع کے چار "امامت" کے قصرِ بے بنیاد کا قصیدہ ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کی توہین تک شامل ہے تو آخر کے دو سرورِ کائنات علیہ السلام سے متعلق ہیں اور اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کو ان کی چاکری کرتے دکھایا گیا ہے ـــــ (نقل کفر کفر نباشد)

اسی طرح کے اشعار دوسری مثنوی کے ہیں ـــــ سوال یہ ہے کہ جو "ننھی کلیاں" زیرِ تعلیم و تربیت ہیں، جنہیں معلوم نہیں کہ کب کھلنا اور کب مرجھانا ہے؛ اس قسم کی نصابی کتابوں سے ان کی سیرت و کردار اور اس سے بڑھ کر ان کی مسلمانی کا کیا بنے گا!

آج کرکٹ و ہاکی کے میدان سے لے کر فوج کے پردگراموں تک "یا علی مدد" کے نعرے لگانے والے سوچیں کہ شرک اور مشرکانہ اعمال کے رسیا، اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اس حال کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ان کے قلوب خوف و دہشت اور رعب غیر سے ہر وقت سہمے رہتے ہیں کیونکہ شرک ایسی بلائے بے درماں ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شکل اجازت نہیں، بلکہ سخت ترین ممانعت ہے ـــــ اور ایسے ہی لوگوں کے لئے "النار" کو "ماوٰی" (ٹھکانہ) کہا گیا (آل عمران آیت ۱۵۱)

دوسرا سبب انتشار و افتراق تھا۔ قرآن عزیز وحدت و اجتماعیت کو اپنی ان نعمتوں میں شمار کرتا ہے جن کے حصول کے لئے دنیا کے خزانے بھی ناکافی ہیں، لیکن ربِّ جہان، اپنی قدرت کاملہ اور رحمت واسعہ سے بندوں کے دل جوڑ دیتا اور انہیں آپس میں شیر و شکر کر دیتا ہے (الانفال۔۶۳) وہ نزاعات اور جھگڑوں کی کیفیت کو "جہنم کے کنارے" کھڑا ہونے سے تشبیہہ دیتا ہے، جس میں کسی لمحہ بھی گرنے کا احتمال ہے، لیکن پھر وہ اس طرح بچاتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں، منتشر متحد ہو جاتے ہیں اور باہم برسرِ پیکار بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ (آل عمران: ۱۰۳) وہ ذاتِ حق مسلم سوسائٹی کو حکم دیتی ہے کہ نزاع کی شکل میں نزاع کرنے والے فریقوں کے درمیان پل بن کر انہیں محبت و اتحاد کے رشتہ میں پرو دو اور اگر کوئی طبقہ رکاوٹ بنے تو اسے "قتال" کے ذریعے راہ راست پر لاؤ۔ (الحجرات: ۹)

وہ کہتا ہے:

لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (الانفال: ۴۶)

آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اس دھرتی پر اللہ تعالیٰ کا آخری نمائندہ، امام الانبیاء، سید المرسل محمد عربی علیہ السلام، عداوت و لڑائی، اختلاف و انتشار اور تفرقہ کی ہر شکل کو مٹانے کی تدبیر کرتا، اور ان پر سخت اظہارِ ناراضی کرتا ہے۔ بعثت نبوی سے پہلے جو لوگ مکہ کی شدید لڑائیوں کو بند کرانے کی غرض سے اہتمام کرتے ہیں، ان کے دست و بازو حضور بنتے ہیں (حلف الفضول کا معاہدہ) اور بعثت کے بعد اس کی برکات کو یاد فرماتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ دنیا کو نزاعات اور جھگڑوں سے بچانے کی غرض سے کوئی اس نوع کا مشورہ اور تدبیر آج بھی ہو تو میں اس میں سب سے آگے ہوں گا۔

لیکن یہ بدنصیبی کی بات نہیں تو کیا ہے کہ آج ایک رب کے پرستار اور محمد کریمؐ کے نام لیوا عرب و عجم اور نہ معلوم کن کن تفرقات کا شکار ہیں ـــــ اور وطن عزیز تو انہی حوالوں سے دو ٹکڑے ہو کر اب پھر ایسی ہی کشمکش کا شکار ہے، مختلف زبانیں، مختلف خطے ان کے مخصوص حالات، ان کا کبھی انکار نہیں ہوا، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ زبانوں اور جغرافیہ کے نام پر انسان، انسان کا، جی نہیں مسلمان مسلمان کا گلا کاٹے ـــــ الحذر ۔ الحذر ۔ الحذر

وہ دین برحق جو انسانوں کو محبت کا سبق پڑھانے آیا، اس کی نسبت و حوالہ سے مذہبی اور سیاسی احزاب و فرق، ہمارے منہ پر زناٹے کا تھپڑ نہیں؟ جمہوریت کی پرستاری کے شوق میں درجنوں سیاسی پارٹیاں اور ان کے حوالے سے نفرت کے لاوے کہاں کا انصاف اور آئین حق کی پاسداری ہے ـــــ کیا ہمارے حکمران، اہل سیاست، پیر و مولوی اور پنڈت و مہنت مسجدوں کی زمین ڈھاکہ اور اس کے اطراف میں گلی گلی مردم آزاری اور انسانیت کشی کی لعنت بھول چکے ہیں، کیا ہمارے حافظے اتنے کمزور اور اس حد تک غافل ہو چکے ہیں، ہمیں کب احساس ہو گا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت راشدہ وحقہ، کے دم واپسیں تک، امت کے اتحاد نے ہمیں کہاں پہنچایا اور جب خلافت راشدہ ہی کے ایک دور مرتضوی میں انتشار نے ہمارے معاشرے میں راہ پائی تو پھر کیا ہوا اور جناب سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جلیل القدر صاحبزادے امام صلح و صفا سیدنا حسنؓ کی صلح جوئی کے سبب حسن و معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، باہم شیر و شکر ہوئے تو پھر رکا ہوا قافلہ کس طرح رواں دواں ہوا ـــــ یہ تو اتفاق و نااتفاقی کے واضح مظاہر ہیں ـــــ لیکن افسوس کہ چشم بینا سے ہم محروم ہیں، اور ہم نے اس لعنت اور عمل منکر کو حکومتی سرپرستی میں پارلیمنٹ، عدلیہ، ذرائع ابلاغ اور ہر ادارے میں پہنچا دیا ـــــ اس کے بعد ہماری ہوا اکھڑے گی یا سلامت رہے گی۔ ؏ الحذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تیسرا سبب دولت کی ہوس اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا جذبہ حیوانی، نہیں شیطانی، آج ہر میر و وزیر، عالم و جاہل منصف و سپاہی میں پیدا ہو چکا ہے، دنیا کے طالب کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :- وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرہ : ۲۰۰)

اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں

اور اللہ تعالیٰ کا آخری نبی، سلام اللہ تعالیٰ علیہ وصلوٰتہ کا حال یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں: مجھے تمہاری دنیا سے کیا سروکار، میں تو ایک مسافر و رہ گذر کی طرح بس درخت کی چھاؤں تلے وقت گذار کر اپنے

باقی صــــ پر

"امیرِ تنظیمِ اسلامی کا پیش کردہ تصوّرِ فرائضِ دینی"

ایک جائزہ

(از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن بنوی)

مولانا الطاف الرحمان بنوی صاحب کا یہ مقالہ دراصل اسی موضوع سے متعلق ہے جو گذشتہ محاضراتِ قرآنی میں بالتفصیل زیرِ بحث آیا تھا یعنی "امیرِ تنظیمِ اسلامی کے پیشکردہ تصورِ فرائضِ دینی کا تنقیدی جائزہ!" ــــ اس ضمن میں جیسا کہ قارئینِ 'حکمتِ قرآن' کے علم میں ہے امیرِ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے تصوّرِ فرائضِ دینی پر مشتمل ایک مختصر تحریر مختلف مکاتیبِ فکر سے متعلق لگ بھگ یک صد علماء کو اس دعوت کے ساتھ ارسال کی تھی کہ وہ 'محاضراتِ قرآنی' میں تشریف لا کر اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں! محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر جو علماءِ کرام تشریف لائے۔ انمیں ایسے علماء کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے اپنے خیالات کو باقاعدہ ایک مقالے کی شکل دی ہو۔ بہرکیف جو مقالات موصول ہوئے ان میں بھی اکثر و بیشتر جو تنقید سامنے آئی اس کا تعلق براہِ راست موضوعِ زیرِ بحث سے نہیں تھا بلکہ بعض ایسے ذیلی اشکالات سے تھا جو درحقیقت ارسال کردہ تحریر کی بعض عبارات میں پیدا شدہ ابہام کے باعث پیدا ہوئے تھے اور اس کا اصل سبب بھی یہ تھا کہ تحریر میں حد درجہ اختصار سے کام لیا گیا تھا۔ اور اجمالِ عبارت ہی درحقیقت ابہام اور اغلاق کا باعث بنا۔ چنانچہ اس نوع کے اشکالات میں سے اکثر کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ تحریری طور پر 'حکمتِ قرآن' (مئی ۸۵ء) کے صفحات میں توضیحات پیش فرما دی تھیں بلکہ محاضراتِ قرآنی سے متصلاً قبل خطبۂ جمعہ میں بھی اسی موضوع پر خطاب فرماتے ہوئے ممکنہ اشکالات کی وضاحت فرما دی تھی ــــ مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب نے محاضرات میں جو مقالہ پیش فرمایا تھا اس میں بھی زیادہ تر گفتگو محاضرات کے اصل موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں تھی بلکہ مولانا موصوف نے بھی محترم ڈاکٹر صاحب کی ارسال کردہ تحریر کی بعض عبارات اور الفاظ پر ناقدانہ تبصرہ فرماتے ہوئے بعض ذیلی اور ضمنی موضوعات ہی کو مرکزِ بحث بنایا تھا ــــ چنانچہ بعد میں محترم ڈاکٹر صاحب نے مولانا موصوف کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کی بنیاد پر گذارش کی کہ وہ نہ صرف یہ کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی پیشکردہ توضیحات کی روشنی میں اپنے مقالے پر نظرِ ثانی فرمائیں بلکہ براہِ راست محاضرات کے اصل موضوع یعنی "امیرِ تنظیمِ اسلامی کے پیشکردہ تصورِ فرائضِ دینی" کو بحیثیتِ مجموعی سامنے رکھ کر اس کے بارے میں

اپنی رائے اور تنقید کو بھی مقالے میں شامل فرمائیں! ــــــ ہم مولانا موصوف کے حد درجہ ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی گذارش کا احترام کرتے ہوئے ہمیں حسب ذیل مقالہ ارسال فرمایا ہے۔

(ادارہ)

ایک اچھے اور سنجیدہ انسان کا کوئی بھی شعوری اور اختیاری عمل اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ اس کی ضرورت کا سچا احساس پیدا نہ ہو اور سچا احساس پیدا ہونے کے لئے اس شئی کا صحیح علم و معرفت لابدی اور ناگزیر ہے، گو یہ بھی ممکن بلکہ واقع ہے کہ کبھی کبھی کوئی ضرورت و احتیاج یا نادریافتی اشتیاق کسی سے ایک ایسا طویل اور کثیر المراحل عمل صادر کرا دیتا ہے جو پہلے سے اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہوتا اور اس طرح سے ہر عمل کے مسبوق بالعلم ہونے کا قاعدہ ٹوٹتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے تاہم دقت نظر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی گو پورے عمل کا تفصیلی خاکہ ذہن میں موجود نہیں ہوتا لیکن کام کا ہر وہ مرحلہ جو قوۃ سے فعل میں آجاتا ہے اپنے بعد والے مرحلے کا اجمالی علم و تصور فراہم کر دیتا ہے جو اقدام کا باعث بن جاتا ہے۔

پھر کام جتنا بڑا ہوگا احساس میں شدت و گہرائی اور علم میں صحت و قطعیت کی مقدار اتنی ہی بڑی ہونی ضروری ہے ورنہ ہلکا احساس یا ظنی علم بڑے کام کو اولاً تو شروع کرنے نہیں دیتا اور اگر شروع کر بھی لیا جاوے تو کسی نہ کسی طور اس کے اتمام و تکمیل کو متاثر کر ہی دیتا ہے

اعلائے کلمۃ الحق کی جد و جہد اس دنیا کا سب سے عظیم کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو اس کائنات کی سب سے قیمتی شئے یعنی انسانی زندگی کا حقیقی مصرف قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس عظیم کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک بہت ہی بھاری احساس کی ضرورت ہے اور یہ احساس اس جد و جہد کے اہداف کا واضح اور قطعی علم ہونے کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرماوے تنظیم اسلامی کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کہ انہوں نے "تصور فرائض دینی" کے عنوان سے متذکرہ بالا اہداف اور ان کے لوازم کا ایک بہت ہی جامع خاکہ امت کے سامنے پیش کیا ہے جو بہت تفصیلی ہونے کی وجہ سے انتہائی واضح بھی ہے اور قرآن و حدیث پر مبنی ہونے کی بدولت بلاشبہ یقینی و قطعی بھی ہے۔

قرآن و حدیث پر غور کرنے والا کوئی بھی صحیح الفکر انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ محض تفنن یا تسہیل و تیسیر کی خاطر تعبیرات و اسالیب میں کتنی ہی گوناگونی روا کیوں نہ رکھی جائے یا انضمام و انشعاب کے نتیجے میں ان کی مقدار و تعداد میں کتنی ہی کمی و بیشی تسلیم کیوں کی جائے فی الواقع انسان

کے دینی فرائض اور ان کے لوازم یہی اور اتنے ہی ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کئے ہیں جن میں سے سہ گانہ فرائض اور دوگانہ لوازم تو محکمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ تیسرے لازم یعنی بیعت کی ایک خاص صورت میں آراء کے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

فرائض دینی کی تثلیث کا مسئلہ تو اس قدر عام اور پھیلا ہوا ہے کہ قرآن و حدیث کے کسی بھی ترغیبی یا ترہیبی اسلوب کا کوئی بھی نص لے کر اس کا تجزیہ کیجئے مآل کار اس کا تعلق انہی وظائف ثلاثہ میں سے کسی ایک سے ظاہر ہو کر رہے گا۔ بھلا! جو شخص ادیان و شرائع سماویہ کے موضوع بحث ـــ جس کی ایک تعبیر تعمیر انسانیت سے بھی کی جا سکتی ہے ـــ کے حقیقی مفہوم کا واقعی ادراک رکھتا ہو اور پھر فرائض ثلاثہ کے ان عنوانات کی معنویت اور جامعیت سے بھی نابلد نہ ہو جو ڈاکٹر صاحب نے قائم کئے ہیں اس کو اس تثلیث کی صحت و صداقت میں شک و شبہ ہو کیسے سکتا ہے۔ باقی رہی ان فرائض ثلاثہ کی ترتیب تو گو تضمین و تلمیح کے طور پر تو دسیوں نصوص سے اس کا استخراج و استنباط ممکن ہے لیکن تفصیل و صراحت کے ساتھ قرآن و حدیث میں اس کا مذکور ہونا معلوم نہیں تاہم پیغمبر اسلام کے مرحلہ وار جدوجہد اور جماعتی انسانی نفسیات کے حاصل مطالعہ اور کئی دوسرے گوشوں سے فکر و تدبر کا ایک حرفی اور دو ٹوک فیصلہ یہی ہے کہ منشا رائیڈ دی کے علی الرغم جز دی اور غیر مشنری طریقے پر تھوڑی سی انفرادی اصلاح کا تھوڑا بہت کام ہو بھی جائے۔ ایک دور رس، ہمہ گیر اسلامی انقلابی کام کے لئے اس ترتیب سے ہرگز مخالفت نہیں۔

جو شخص اپنی تشکیل سیرت اور اصلاح کردار سے غافل و بے پرواہ مختلف اخلاقی کوتاہیوں سے داغدار ہو اس کی دعوتی اور تبلیغی پروگراموں کی ناکامیوں پر ہماری تاریخ کے بے شمار انتہائی تلخ تجربات کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم تذکیر و تنبیہہ کے طور پر اتنا سا اشارہ کرنا بے موقعہ و نامناسب نہیں ہے کہ ایسا شخص اس سوز و گداز اور اضطرابی کیفیت ہی سے محروم ہوتا ہے جو لوگوں کو متوجہ کرنے اور اپنی بات کو ان کے اعماق قلوب میں اتارنے کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور جب تک ذہنی رسوخ اور دلجمعی کا یہ مرحلہ سر نہ ہو، ہوا و ہوس کے لحمی شحمی انسانی مجسموں کو اقامت دین کے صبر آزما اور جانگسل مجاہدوں پر آمادہ کرنے کی امید رکھنا وہ خام خیالی اور پریشان خوابی ہے جس کی لاحاصلی روز روشن کی طرح عیاں و نمایاں ہے۔

اس دعوے کی تائید و توثیق اس بالکل تر و تازہ اور نقد صورت حال سے بھی ہوتی ہے کہ ہمارے

ہاں کی تبلیغی جماعت کی دعوتی سرگرمیاں بڑے بڑے علماء وفضلاء کی سرگرمیوں سے بھی نسبتاً زیادہ وسیع اور مؤثر ثابت ہو رہی ہیں جس کی سوائے اس کے اور کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی کہ جماعت کے اندر تعلیم فضائل کے ساتھ ساتھ تعمیل فضائل کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جس کی برکت سے دلوں میں وہ انابت پیدا ہوتی ہے جس کے ظاہری آثار کا رنگ دوسروں کو بھی رنگین کر کے رہتا ہے۔

اور اب یہ بہت ہی تکلیف دہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ اس جماعت پہ بھی حال پہ قال غالب آرہا ہے۔ اور اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا جاسکا ولا فعلہا اللہ تو اس کا انجام بھی اس خانقاہی اور مدرسی نظاموں سے کچھ بھی مختلف نہ ہوگا جن میں سے ہر ایک اس وقت تک تو بہت قیمتی اور گرانقدر دینی خدمات انجام دیتا رہا ہے جب تک کہ اس کے اہل کار میں قول وفعل کی یکسانی باقی رہی لیکن جونہی ان کی بھاگ دوڑ ان عملی نامرادوں کے ہاتھوں میں آئی جو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ فقط وراثت یا بخت واتفاق سے ان کے جانشین ٹھہرے، تو دونوں کی تاثیر وکارکردگی بری طرح متاثر ہوئی اور اب حال یہ ہے کہ اول الذکر کا تو یہ اپنے کھنڈرات یا تاریخی حکایات کے سوا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا اور ثانی الذکر اپنی روز افزوں وسعتوں کے باوجود قالب بے جان کا مصداق بنتا چلا جارہا ہے۔

فرائض ثلاثہ پہ عملدرآمد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ان کے تین لوازم جہاد، جماعت اور بیعت کا ذکر فرمایا ہے جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے اول الذکر دو لوازم تو اس قدر اٹل اور محکم ہیں کہ اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں ـ آپ جہاد کو سعی وکوشش کے وسیع لغوی مفہوم میں لیں کہ جس پہ اکثر قرآنی وحدیثی اطلاقات کی بنا ہے پھر تو تینوں فرائض کا اس پر توقف بالکل ظاہر وباہر ہے کہ کسی فریضے کی ادائیگی بھی جہد ومشقت کے بغیر ممکن نہیں اور اگر اس کو قتال کے محدود فقہی معنی کے ساتھ خاص کرلیں اور یہ اصطلاح بھی بعض قرآنی وحدیثی استعمالات سے ماخوذ ہے۔ مثلاً:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ [1] : الجهاد ماضٍ الى يوم القيامة تو فریضۂ ثالث یعنی اقامت دین میں اس کا عمل دخل تو کسی ثبوت کا محتاج نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسلام کی سیاسی بالادستی کے بغیر ممکن نہیں اور سیاسی بالادستی کے لیے طاقت کا استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ باقی رہے دین پہ عمل کرنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کے دو فریضے، تو اولاً تو سیاسی بالادستی کے بغیر خود یہ دو فریضے بھی معرض خطر میں ہوں گے کہ یا تو غیر اسلامی سیاسی قاہر سرے سے مسلمانوں کے شخصی اعمال میں بھی آزادی کا قائل اور روادار نہ ہوگا اور یا کم سے کم غیر اسلامی معاشرے میں وہ مناسب فضا اور سازگار ماحول مہیا ہرگز نہ ہوگا جو ان

---

[1] بعض مفسرین نے "جَاهِدِ الْكُفَّارَ" کے بعد "بالسَّيف" کے الفاظ محذوف مانے ہیں۔

فرائض کی ٹھیک ٹھیک بجا آوری کے لئے ضروری ہے اور ثانیاً اگر ان دو فرائض پر عمل کسی درجے میں ممکن بھی ہوا تو فریضۂ ثالث پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مجموعۂ فرائض سے سبکدوشی تو بہرحال سیاسی غلبے پر موقوف ہے ہی، سو قتال سے خلاصی کی کوئی سبیل نکل نہیں آتی۔

ضرورتِ قتال کی یہ بحث تشنہ رہے گی اگر مندرجہ ذیل تین باتیں پیشِ نظر نہ ہوں۔ اولاً یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ایسا ہی فرض اور ضروری ہے جیسے کہ شخصی اصلاح اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد۔ بعض لوگوں کو دین کی اس بدیہی بات میں بھی شبہ ہے کہ واقعتہً اسلام کے سیاسی غلبے کی سعی و کوشش بھی مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ چنانچہ اس ذہنیت کے لوگوں کے ہاں قتال کی ضرورت میں کلام کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ ثانیاً یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مسلسل توسیع اور افزونی مطلوب ہے۔ یہاں تک اگر انسانی آبادی کا ایک بہت معمولی سا معلوم حصہ بھی اسلام کے اقتدار سے خارج ہے تو اس جدوجہد کا میدان باقی ہے۔ ثالثاً یہ کہ اسلام اقتدارِ عامہ کے سوا کسی دوسری بات پر سمجھوتہ کرنے کا روادار ہرگز نہیں۔

ان تینوں باتوں کے اثبات کے لئے سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کا یہ حصہ بالکل کافی و شافی ہے

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ

اہمیت و اولیتِ قتال پر جو عقلی جائزہ آپ کے سامنے آگیا ہے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے اسی سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۵ کا یہ ٹکڑا وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ، بہت قابلِ لحاظ ہے، علامہ بیضاویؒ نے اس کی کئی تقدیروں کے ساتھ ایک تقدیر یہ بھی نکالی ہے اے بالکف عن الغزو والانفاق اور بلاشبہ سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ تقدیر بہت عمدہ اور برمحل ہے۔

قرآن و حدیث اور خیر القرون کے تاریخی مطالعے سے اسلام اور مسلمان کا جو حلیہ منتزع ہوتا ہے اس میں زندگی، حرکت اور وسعت پذیری کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ اس حلئے میں مخصوص حالات کے سوا، جہاں عینی و جہاں بانی کی صفات کا ایسا غلبہ نظر آتا ہے کہ گویا یہی اس کے اصل عناصرِ ترکیبی ہیں کیا اس حلئے اور شخصیت کا اس کے بغیر تصور کیا جا سکتا ہے کہ جہاد اپنے دونوں مفہوموں سمیت اس میں سمویا ہوا ہو۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ماننا پڑے گا کہ مسلمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جہاد کے لئے التزامِ جماعت کی ضرورت میں تو عقلی طور پر کوئی نظریت ہے ہی نہیں جو محتاجِ ثبوت ہو

صرف اطمینان خاطر کے لئے نقل کی تائید چاہیے سو اس سلسلے میں ان بے شمار نصوص سے صرف نظر کرتے ہوئے جو اس مدعا میں بالکل واضح اور صریح ہیں فقط ایک ایسی لطیف قرآنی اشارت پر اکتفا کی جاتی ہے جو تاثیر و دلالت میں کئی عبارتوں پر بھاری ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۝ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا تو اخراج و تخلیق ہی بوضع اُمّت و جماعت ہے اس وضع و ہیئت کے بغیر نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی خیریت و فضیلت نہیں کہ یہی چیز تو وجہِ خیریت یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضامن و متکفل ہے بلکہ سرے سے ان کا وجود ہی کالا وجود ہے۔

لوازم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے تیسری اور آخری چیز بیعت ذکر کی ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص پر مخفی نہیں کہ مسلمانوں کا امیر جماعت دین و سیاست کے دونوں پہلوؤں کی مرکزیت کا جامع ہوا کرتا ہے۔ نبوّت اور اس کے بعد خلافت کی پوری مدّت میں یہی صورتِ حال رہی اور اس دور میں بھی جب کبھی اسلام کو بحیثیت دین غلبہ حاصل ہوا۔ امیر دونوں قیادتوں کا مرکز قرار پایا۔ یہ ہمہ جہتی مرکزیت کوئی قضیہ اتفاقیہ نہیں بلکہ اسلام کی رُو سے تشکیلِ جماعت اور تقسیم کار کا جو ضابطہ ملے پایا اسی کے مطابق پورے شعور اور قصد و ارادے کے ساتھ ایسا کیا جاتا رہا۔

اسلام نے یہ طرزِ عمل کیوں روا رکھا، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر مستند گفتگو کرنی ماہرینِ شریعت کا کام ہے۔ ہمیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ اس کے نتیجے میں امیر کی ذمّہ داریوں میں بے حد اضافہ ہوا، ان بھاری ذمّہ داریوں کو نبھانے کے لئے راعی اور رعیّت کے مکمل ظاہری اور باطنی توافق کی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر اپنے وزن کو امیر کے وزن میں ڈالنے اور جماعتی قوّت پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور یہ توافق امیر کی ذات پر پورے اعتماد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اسی اعتماد کا اظہار و اعلان کرنے کے لئے بیعت کا طریقہ اپنایا گیا جو دورِ نبوّت و خلافت میں تو پورے زور و شور سے برابر جاری رہا اور اس کے بعد بھی ایک طویل زمانے تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہا۔

فی زمانہ انتخابِ امیر کے سلسلے میں جتنے بھی طریقے مروّج ہیں نفسیاتی طور پر بیعت کا طریقہ ان سب میں زیادہ پُرتاثیر اور پُرشکوہ ہے۔ نیز بیعت براہِ راست امیر کے ہاتھ پر ہو یا وسعتِ مملکت

اور کثرتِ آبادی کی بدولت مختلف اطراف و اکناف میں اس کے مقرر کردہ نائبین کے ہاتھ پر ہو، دھاندلی اور فریب کاری کی ان تمام صورتوں سے نسبتاً زیادہ مامون و محفوظ ہے جن سے آج کل کی غیر مستحق امارتیں بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بہرحال نبوت و خلافت کے بعد جہاں بے شمار دوسرے ریاستی تقاضے پامال کئے جاتے رہے وہاں بیعت کا طریقہ بھی متروک ہوتا چلا گیا تا آنکہ آج ایسی باتیں بڑی ناگواری سے سُنی جاتی ہیں۔

بیعت کے اس نوع میں تو کسی بھی اہلِ علم کو اختلاف نہیں، سب جانتے اور مانتے ہیں کہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کا یہی طریقہ ماثور و محبوب ہے اور غالباً اس پر بھی اتفاق ہے کہ نظامِ خلافت ٹوٹنے اور عالمِ اسلام کا مختلف حصّوں میں بٹنے کے بعد بھی ہر سیاسی اکائی اور انتظامی یونٹ کا مسلمان سربراہ بیعتِ امارت کا مجاز ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی کو بھی ایسی بیعت (بیعتِ امارت) لینے کا حق حاصل نہیں؛ اختلاف فقط اس میں ہے کہ ایسی ہر کسی یونٹ میں بیعتِ جہاد لینی بھی ممنوع ہے یا نہیں۔ سو ایک فریق نے تو جہاد کو قتال کا ہم معنی سمجھ کر جھٹ سے اس بیعت کو ناجائز اور اس کے مرتکب کو گردنی زدنی قرار دیا، ایسے لوگوں نے نہ صرف ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی کی مذمت کی بلکہ تبلیغی جماعت کو بھی (بشمول کچھ دوسری وجوہ کے) اس وجہ سے تحقیر و تضحیک کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے جہاد سے متعلق اکثر قرآنی و حدیثی فضیلتوں کو دعوت و تبلیغ کی جدوجہد پر بھی فٹ کیا ہے۔ اس اعتراض کا شافی جواب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ نے اپنی ایک جوابی تحریر میں دیا ہے جس پر اضافے کا امکان نہیں۔

ایک دوسرا فریق جہاد اور قتال کے فرق و تفاوت کو جانتے اور مانتے ہوئے بھی بیعتِ جہاد پر معترض ہے۔ اس فریق میں یہ کہنے والا تو شاید کوئی بھی نہیں ہوگا کہ غلبہ و اقامتِ دین کیلئے سرے سے جماعتی جدوجہد ہی غیر مشروع ہے ورنہ تو تنظیم اسلامی کی کیا تخصیص، پاکستان کی دوسری تمام دینی کہلائی جانیوالی سیاسی جماعتوں کی مساعی بھی نامشکور ہوں گی جس کا اصولاً کوئی بھی قائل نہیں، اب اعتراض کے لئے صرف یہی ایک بات رہ جاتی ہے کہ امارتِ کلیہ کے سوا کسی دوسری جزئی دینی محنت کے لئے بیعت کا شرعی ثبوت موجود نہیں ہے تو اس کا سہل جواب یہ ہے کہ عقبۂ اولیٰ و ثانیہ میں نبی علیہ السّلام کے ہاتھ پر انصار کی بیعت، بیعتِ امارت تھی؛ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے کہ امارت تو ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں منعقد ہوئی۔ ایک موقعہ پر بعض عورتیں بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئیں تو آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو بیعت فرمایا، سورۃ ممتحنہ آیت ۱۲ میں

یوں ارشاد ہے۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

واضح بات ہے کہ یہ بیعت بھی بیعتِ امارت نہ تھی بلکہ شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، بہتان تراشی اور نیک کاموں میں نافرمانی سے اجتناب پر تھی، اسی طرح سے حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان خالصتاً جہاد بمعنیٰ قتال پر ہوئی، خلاصہ یہ کہ امارتِ کلّیہ کے علاوہ بھی دین کے دوسرے جزئی امور پر بیعت امّت کے اندر منقول و مأثور ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث علّامہ نووی کی تشریح کے ساتھ پیشِ خدمت ہے جس سے اس مدعا پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ عُثْمَانَ اَخْبَرَنِیْ مُجَاشِعُ بْنُ مَسْعُوْدٍ السُّلَمِیُّ قَالَ جِئْتُ بِاَخِیْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الْفَتْحِ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بَایِعْهُ عَلَی الْهِجْرَةِ قَالَ مَضَتِ الْهِجْرَةُ بِاَهْلِهَا قُلْتُ بِاَیِّ شَیْءٍ تُبَایِعُهٗ قَالَ عَلَی الْاِسْلَامِ وَالْجِهَادِ وَالْخَیْرِ:	مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی ابوسعید کو آپ کی خدمت میں فتح مکّہ کے بعد لے گیا اور عرض کیا یارسول اللہ ان سے ہجرت پر بیعت لے لیجئے، آپ نے فرمایا ہجرت تو مہاجرین پر ختم ہو چکی۔ میں نے عرض کیا پھر کس چیز پر آپ بیعت لیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: اسلام پر، جہاد پر اور نیک اعمال پر۔

علّامہ نوویؒ نے اس کی شرح میں فرمایا، البتہ دوسری چیزوں یعنی امورِ خیر جہاد اور اسلام پر بیعت لی جاسکتی ہے۔ اور یہ چیزیں بجائے خود بڑی اہمیت اور خصوصیت کی حامل ہیں حدیث بالا اور نوویؒ کی تشریح سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امورِ خیر پر بیعت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ مشروع و متوارث ہے۔ صوفیاء کا بیعت ارشاد اسی بنیاد پر استوار ہے جس کی کسی زمانے میں بھی کوئی معتدبہ مخالفت نہیں ہوئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سائنسی منہاج" اور جدید فکر

ڈاکٹر ابسار احمد
(شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سائنس نے ایک مخصوص سائنسی منہاج کے تحت جب یہ دریافت کیا کہ کائنات میں علت اور معلول (CAUSE AND EFFECT) کا ایک نظام ہے۔ تو اس تعبیر کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس علم نے کائنات کی جو تصویر بنائی تھی وہ ایک حد درجہ محکم اور منظم کائنات کی تھی۔ اس میں یہ قیاس کیا گیا تھا کہ یہ ایک قسم کا مشینی نظام ہے جو اسباب و علل کے زور پر چل رہا ہے۔ اس علمی دریافت کو منکرین مذہب نے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے نزدیک یہ دریافت خدا کا سائنسی بدل تھا۔ اگرچہ اس قانون کو دریافت کرنے والے سائنسدانوں کے لئے اس کے یہ معنی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر نیوٹن نے کہا تھا کہ یہ خدا کا طریق کار ہے۔ خدا اسباب و علل کے ذریعے کائنات میں اپنی منشا کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو سائنسی دریافتوں کی روشنی میں طبیعی فلسفہ کی تشکیل کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کے اندر الحاد اور انکار مذہب کا ثبوت پالیا۔ اور اسکی بنیاد پر ایک پورا نظام فکر بنا ڈالا۔ اس طرح وہ نظریہ وجود میں آیا جس کو کائنات کی مشینی تعبیر کہا جاتا ہے۔ مسلمہ طور پر یہ مان لیا گیا کہ کائنات کے تمام واقعات کسی خارجی مداخلت کے بغیر محض مادی اسباب کے تحت واقع ہوتے ہیں، اور اس طرح پوری کائنات علت و معلول کی ایک مسلسل زنجیر میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کا مسلمہ تھا۔ ۱۸۷۴ء میں چھپنے والے ایک انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"طبیعی فلاسفہ، کیمسٹری اور فزیالوجی کے ماہرین یقین رکھتے ہیں کہ ایک سبب سے ہمیشہ یکساں نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اور ایک مثال میں اگر یہ تصور کامیاب ہو تو ان کو اطمینان ہے کہ ہمیشہ یہی کامیابی حاصل ہوگی۔ اس لئے طبیعی علوم میں اب

قانون تعلیل (LAW OF CAUSATION) کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہ گیا - اس باب میں اختلاف صرف مابعد الطبیعاتی حلقہ میں پایا جاتا ہے"

(بحوالہ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا جلد دوم صـ ۶۹۱)

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا اٹھارویں اور انیسویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا - چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آگئی - یہ زمانہ ایسے سائنس دانوں کا تھا - جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں اسی زمانہ میں ہیلم ہولٹز (HELM HOLTZ) نے کہا تھا کہ "تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر دینا ہے" اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنس دانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی، مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہو سکتی ہے - وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا -

کائنات کی یہ توجیہہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی - مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ استقرار بودی اور کمزور توجیہہ تھی کہ خود سائنسدانوں کو بھی اس پر کبھی شرح صدر حاصل نہ ہو سکا - یہ توجیہہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی - مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرک اوّل کو معلوم کر لیا ہے، اور اس محرک اوّل کا نام اس کے نزدیک "اتفاق" ہے - سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادّہ تھا اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آگیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی جس واقعہ کے اسباب نہ مادّہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادّہ کے باہر، وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے؟ اس توجیہہ کا یہ نہایت دلچسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو اس کو ظاہر ہونے والے واقعے کا سبب بن سکے - مگر اس توجیہہ کی ابتدا ایک ایسے واقعے سے ہوتی ہے جس سے پہلے اسکا سبب

موجود نہیں۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پر کائنات کی اتفاقی تکوین کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔ پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رُخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انہوں نے اختیار کیا۔ اسکے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادّہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ارتقائی حرکت بن جائے، اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کے لئے سعی شروع کرے۔ آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلاؤں میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی۔ جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشے میں نظام شمسی کو وجود بخشا۔ پھر وہ کیا وجہ تھی جس سے ہمارے کرۂ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں، جن کی بدولت یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا۔ اور جن تبدیلیوں کا سراغ آجتک کائنات کی بے شمار دنیاؤں میں کسی ایک دنیا میں معلوم نہیں کیا جا سکا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادّہ سے جاندار اور نامیاتی مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ان تمام سوالات کے جواب کے لئے اصول تعلیل (LAW OF CAUSATION) پیش کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اوّل کے بعد کائنات میں علّت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں۔ تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علّت و معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے حتیٰ کہ جس سوئٹ میں تاریخ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آئندہ سلسلہ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک بار متعین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے ترقی متصور تک

پہنچ سکتی تھی - گویا جس روز کائنات وجود میں آئی اس کی مستقل تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے -

ان سائنسی تصورات کا انسانی زندگی اور اسکے حقائق سے تعلق صاف ظاہر تھا - اصول تعلیل کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے اختیار انسانی پر یقین کرنا محال بنا دیا - کیونکہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو انسانی زندگی اس سے کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی ہے - اس طرز فکر کے نتیجے میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے - جب یہ دریافت ہوا کہ جاندار خلیہ (LIVING CELL) بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ تمام اجزاء جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں کیونکر تعلیل کے دائرہ سے باہر ہو سکتے ہیں - چنانچہ یہ گمان کیا گیا بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خالص مشین ہے - یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن، باخ مائیکل انجلو اور دیگر انسانوں کے دماغ چھاپنے والی مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے اور ان کا کام محض یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں -

مگر واقعہ یہ ہے کہ ان مفکرین کی یہ جوشیلی کیفیت زیادہ دیر باقی نہیں رہی - کیونکہ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں سائنس کے علم میں ایسے بہت سے حقائق آئے جو کسی طرح مشینی تعبیر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے - مثال کے طور پر ریڈیم ایک تابکاری (RADIO ACTIVE) عنصر ہے اس کے الکٹران خود بخود فطری عمل کے تحت مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں - یہ معلوم کرنے کے لئے بے شمار تجربے کئے گئے کہ اس تابکاری کا سبب کیا ہے اسی طرح مثال کے طور پر مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے - اس کی توجیہہ میں سائنس نے بہت سے نظریات قائم کئے ہیں - مگر ایک سائنسدان ان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ مقناطیس کیوں لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے "شاید اس لئے کہ اس کے خالق نے اس کو یہی حکم دیا ہے "

یہ صرف ریڈیم اور مقناطیس کی بات نہیں ہے - گہرے تجزیے نے بتایا ہے کہ ماضی میں جن باتوں کو کسی واقعہ کا سبب مان لیا گیا تھا وہ بھی اصل واقعہ کا محض سطحی مطالعہ تھا - حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی واقعہ کے بارے میں معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے - حتیٰ کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم رات کو سوتے ہیں تو ہمیں نیند کیوں آتی ہے - طویل بحث مباحثہ

کے بعد اب سائنس کی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قانون تعلیل ان معنوں میں کوئی مطلق حقیقت نہیں ہے جیسا کہ انیسویں صدی میں فرض کر لیا گیا تھا۔ علم کا مسافر دوبارہ لوٹ کر وہیں پہنچ گیا ہے جہاں وہ پہلے تھا۔ چنانچہ اب سائنسدانوں کی کثیر تعداد اس حقیقت کا اقرار کر رہی ہے کہ اس دنیا کا نظام محض اتفاقی طور پر وجود میں آنے والے کسی علت و معلول کے قانون کے تحت نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک شعوری ذہن ہے جو بلا ارادہ اس کو چلا رہا ہے۔

جدید سائنس پچھلی صدی میں رائج سخت اور غیر معتدل قسم کے اصول علت کی قائل نہیں رہی ہے۔ مثلاً نظریہ اضافیت (RELATIVITY THEORY) اصول تعلیل کو دھوکے (ILLUSION) کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آواخر ہی میں سائنس پر واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی، قوت کشش، زندہ افراد کی حرکات، وغیرہ میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو روز اوّل سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لئے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنسدانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (NON-MECHANICAL REALITY) کی طرف لئے جا رہا ہے۔ مارٹن وائٹ (MORTON WHITE) کے الفاظ میں "بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنسدانوں نے ایک نئی جنگ کا آغاز کر دیا ہے جس میں وہائٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جیمز جینز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔" ان علماء کا فکر صریح طور پر کائنات کی مادّی تعبیر کی نفی کرتا ہے۔ مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے خود جدید طبیعیات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں وہی الفاظ صحیح ہیں جو مارٹن وائٹ نے وہائٹ ہیڈ کے متعلق لکھے ہیں "یعنی وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادّہ پرستی کے شیروں کو ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔" انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی الفریڈ وہائٹ ہیڈ (1861 1947)

کے نزدیک جدید معلومات یہ ثابت کرتی ہیں کہ "فطرت بے روح مادہ نہیں، بلکہ زندہ فطرت ہے"۔ انگریز ماہر فلکیات سر آرتھر ایڈنگٹن (1944–1882) نے موجودہ سائنس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "کائنات کا مادہ ایک ذہنی شے ہے"۔ ریاضیاتی طبیعیات کا انگریز عالم سر جیمز (1946–1877) جدید تحقیقات کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے "کائنات، مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے"۔ یہ انتہائی مستند سائنسدانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ جے ڈبلیو، این سلیون کے الفاظ میں یہ ہے کہ "کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے"۔ اس نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ "موجودہ صدی میں سائنس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہوئی ہے اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لئے زیادہ طاقت حاصل ہو گئی ہے بلکہ وہ تبدیلی ہے جو اس کی مابعد الطبیعیاتی بنیادوں میں واقع ہوئی ہے۔ اسی طرح جیمز جینز کے الفاظ میں "جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح کو قبول نہیں کرتی، اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ اب محض ایک ذہنی تصور ہے۔ یعنی جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ کو امواج برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لئے بالکل ناقابل ادراک ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں ہوں جن کا کوئی وجود نہ ہو۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے وجوہ سے جیمز جینز اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں بلکہ تصور ہے وہ مکمل طور پر ریاضیاتی ڈھانچہ ہے۔ یہ تصور کہاں واقع ہے؟ اس کا جواب اس کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ایک عظیم ریاضیاتی مفکر —— (MATHEMATICAL THINKER) کے ذہن میں ہے۔

گزشتہ صدی میں سائنس اور سائنٹفک منہج کے علمبرداروں کا خیال تھا کہ یہ منہاج ان کے لئے ہر قدم اور ہر مسئلے کے حل میں مدد ہوگا۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ سائنس کی ترقی لامحدود ہے اور اس کے ذریعے انسان ایک آئیڈیل معاشرہ اور پرسکون زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن موجودہ صدی کے وسط میں دنیائے عظیم دانشوروں اور سائنسدانوں نے اقرار کر لیا ہے کہ یہ سب خوش فہمی تھی۔ سائنس ... ٹیکنالوجی ... پروگریس ... اقتصادی ترقی ... ڈیولپمنٹ ... اور جدیدیت پر مشتمل جو لائحہ عمل مغربی فلاسفر اور اور اہل دانش نے اپنے لئے تجویز کیا تھا اور جس کے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ

ذہنی سکون امن اور چین و آشتی حاصل کر سکیں گے، اب بہت سے اہل عقل و بصیرت کو دعوت فکر دے رہا ہے اور انکی سوچ میں ایک بنیادی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ میں اس ضمن میں بہت سے شواہد پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن جگہ کی کمی کے باعث صرف ایک حوالے پر اکتفا کروں گا۔ تہذیب و تمدّن اور ٹیکنالوجی کے ربط و تعلق کے موضوع پر عمر بھر ریسرچ کرنے کے بعد مشہور امریکی سوشل نقاد لوئس ممفرڈ جس نتیجہ پر پہنچا وہ درج ذیل ہے۔

"Nothing less than a profound reorientation of vaunted technological 'way of life' will save the planet from becoming a lifeless desert."

سائنسی منہاج کی خامیوں کی طرف فرانسیسی مائیکرو بائیولوجسٹ رینے ڈوبو اور فرانس ہی کے ماہر اجتماعیات ژاک ایلل نے بھی زور دار علمی انداز میں نشاندھی کی ہے۔ ان تمام مفکرین کا خیال ہے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ طبیعی علوم اور سائنٹفک منہاج کو دوبارہ مابعد الطبیعیات سے مربوط کیا جائے۔ پچھلی صدی کے سائنٹفک منہاج اور اس پر قائم شدہ علمیاتی نظریات میں اقدار، مذہبی جذبات اور مابعد الطبیعاتی افکار کو بالکل فرسودہ اور غیر متعلق تصور کیا گیا تھا۔ لیکن منہاجیات کے موضوع پر گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران جو اہم مقالات لکھے گئے ہیں، ان میں گزشتہ صدی کے رائج وحدانی اور لاقدری (VALUE-FREE) قسم کا منہاج شدید تنقید کا نشانہ بنا ہے۔ ان جدید مفکرین کا خیال ہے کہ علم کے منہاج کو وسیع النظری کے ساتھ کسی سوسائٹی کے تہذیبی اور دینی خیالات کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ ان مفکرین میں پال فیرا بنڈ، اوپن ہائمر، شوڈنگر اور فرٹجوف کاپرا کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ پال فیرا بنڈ (PAUL FEYERABEND) کی تصنیف کا ٹائٹل ہی "AGAINST METHOD" بڑا معنی خیز اور اہم ہے۔ گزشتہ دو صدیوں سے رائج سائنٹفک منہاج پر سخت تنقید کرتے ہوئے اس نے ایک طرح کی "انتشار پسند علمی منہاج" (ANARCHISTIC THEORY OF KNOWLEDGE) کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صرف اس قسم کی علمیاتی انارکی کا منہاج ہمیں ماڈرن سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل سے نجات دلا سکتا ہے۔ اور جدید معاشرہ کے مسائل زیادہ بہتر طور پر حل کرنے کی راہیں سجھا سکتا ہے۔ اس نے بالخصوص سائنس کو لوگوں اور تہذیبوں کے دینی اور مابعد الطبیعاتی عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

یہ بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ مغربی سائنس، اس کی مادّہ پرستانہ تہذیب اور اس کے ملحدانہ علمی منہاج نے انسانیت کے قافلے کو ذہنی امن و سکون اور مستحکم ترقی کی بجائے الٹا نقصان پہنچایا ہے اور تباہی کی طرف دھکیلا ہے۔ یورپ کے بعد اب امریکہ کے بعض دانش ور بھی 'جدیدیت' اور 'سائنٹفک ترقی' جیسے تصورات کی محدودیت اور نقائص کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ترقی اور ڈیولپمنٹ کے دو مرکزی خیالات کو کھلے طور پر چیلنج کیا جا رہا ہے: اولاً، یہ کہ صرف مادّی ساز و سامان اور مصنوعات کے انبار ہی انسان کیلئے قابل فخر سرمایہ نہیں ہیں۔ ثانیاً، یہ کہ ہم کسی سوسائٹی کے اعلیٰ مقام کا تعین اس کی مادّی اور اقتصادی ترقی کے حوالے سے نہیں کر سکتے۔ یہ چیزیں تو اکثر و بیشتر سوسائٹی اور تہذیب کی ان مخصوص بنیادی اساسات کو منہدم کر دیتی ہیں جن کے بل پر اُن کا اپنا تشخص قائم ہے۔ چنانچہ مغربی دنیا میں اب چوٹی کے ماہرین اقتصادیات اور منصوبہ بندی کے علماء "ZERO-GROWTH MOVEMENT" کو مثبت خیر کے طور پر پیش کر رہے ہیں ان کے خیال میں اب انسانیت کو مادّی ترقی کی بجائے رُوحانی اقدار اور تہذیبی تشخص اور معانی کے تحفظ کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔

سطور بالا کی روشنی میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کو ایک ایسا عفریت جو انسانیت کو نگلنے کے درپے ہے، پنپنے سے صرف اسی صورت روکا جا سکتا ہے کہ عالمی سطح پر اہل عقل و دانش اور اہل سائنس مل کر جدید سائنٹفک علوم اور سائنسی منہاج کو ایک انسانیت نواز چہرہ دینے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں دقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ طبیعی علوم بالخصوص فزکس اور مابعد الطبیعیات دونوں کو ایک وحدت کے طور پر دیکھا جائے۔ علم اور اقدار کی تفریق کو ختم کر کے انہیں دوبارہ باہم دگر لازم و ملزوم سمجھا جائے۔ صرف اس طور ہی جدید انسان کے نفسیاتی اور رُوحانی عوارض کا مداوا ممکن ہے۔

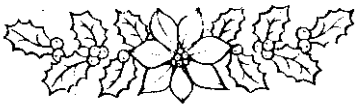

مولانا محمد تقی امینی

قسط (۶)

ہدایت القرآن

سورۂ بقرہ مدنی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

بقرہ کے معنی گائے اور بیل دونوں کے ہیں یہ سورت کا نام ہے اس میں بیان کئے گئے ایک واقعہ میں بقرہ کا ذکر آیا ہے اسی مناسبت سے یہ نام تجویز ہوا۔ سورت کی تقریباً تمام آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں دو ایک آیتیں اگر مکہ میں نازل ہوئی ہیں تو اس سے مدنی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں اللہ، انسان اور ہدایت کا تعارف کرانے کے بعد اب کتاب ہدایت شروع ہوتی ہے یعنی وہ کتاب جس کو اللہ نے انسان کی ہدایت کے لئے اُتاری ہے جس میں صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ صراط مستقیم (سیدھا راستہ) جس کو سورۂ فاتحہ میں انعام پائے ہوئے لوگوں کا راستہ بتایا گیا ہے۔

الٓمٓ۔ الف۔ لام۔ میم۔ حروف مقطعات۔

۲۹ سورتوں کے شروع میں اس قسم کے حروف آتے ہیں جیسے الٓمٓ۔ الٓمٓرٰ المٓصٓ، کھیٰعٓصٓ وغیرہ۔ یہ حروف مقطعات کہے جاتے ہیں جس کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کئے ہیں یعنی یہ حروف ملا کر نہیں پڑھے جاتے بلکہ الگ الگ اسطرح پڑھے جاتے ہیں الف لام میم۔ الف، لام، را۔ الف، لام، میم، صاد۔ کٓ، ہا، یا ع، ص وغیرہ۔

حروف مقطعات کے بارے میں ہمارے علماء و مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں جو ہر ایک کے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ہیں اور جس طرح ہر ایک کے ذوق میں اختلاف ہوتا ہے ان اقوال میں بھی اختلاف ہے۔ لیکن اس مسئلہ کی تین باتوں میں غالباً کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۱) کسی مستند روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان حروف کے مقاصد

معانی اور مطالب نہیں بیان کئے گئے ہیں ۔

(ب) کسی مستند روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ صحابہؓ یا کسی اور نے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا ہو، نہ سوال کرنا ثابت ہے اور نہ جواب دینا ثابت ہے ۔

(ج) کسی مستند روایت میں کسی مخالف شخص کا اعتراض بھی ثابت نہیں ہے جب کہ مخالفت کرنے والے اعتراض کرنے میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے تھے ۔

ان حالات سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔

(۱) یہ حروف اس قدر سہل اور آسان ہیں کہ نہ کسی نے ان کے بارے میں سوال کرنے اور اعتراض کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود ان کو واضح کرنے کی ضرورت سمجھی ۔

(۲) یہ حروف اس قدر مشکل و دشوار ہیں کہ کسی کے قابو میں آنے والے نہیں ہیں ۔ اسی بنا پر نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور نہ لوگوں ہی نے سوال کرنے اعتراض کرنے کی ہمت کی ، لوگ جانتے تھے کہ جب ان کے معانی اور مطالب سمجھ میں آنے والے نہیں ہیں تو خواہ مخواہ ان کے پیچھے کیوں پڑا جائے ۔

دوسری بات یعنی ان حروف کو محض اس بنا پر مشکل و دشوار قرار دینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفصیل نہیں بیان کی یا کسی نے ان کے بارے میں سوال و اعتراض نہیں کیا علمی دنیا کے لئے اس کو تسلیم کرنا آسان بات نہیں ہے ۔ اللہ کی ذات و صفات اور عالم غیب سے متعلق بھی کچھ نہ کچھ تفصیل (لوگوں کی سمجھ کے مطابق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود بیان فرمائی ہے یا لوگوں کے سوالات و اعتراضات کے جواب دیئے ہیں حالاں کہ یہ سب مشکل و دشوار کی فہرست میں سرفہرست ہیں لیکن حروف مقطعات کے بارے میں ان میں سے کسی کا ثبوت نہیں ملتا ہے، ایسی حالت میں لامحالہ پہلی بات کو ترجیح دینا ہوگا یعنی یہ حروف اس قدر سہل و آسان ہیں کہ نہ ان کے بارے میں کسی نے سوال و اعتراض کیا اور نہ خود رسول اللہ علیہ وسلم نے ان کو واضح کرنے کی ضرورت سمجھی ۔

ان حروف کے سہل و آسان ہونے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان کو "فواتح سورت"

قرار دیا جائے یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ ان کو صرف سورت کی ابتدار کے لئے لایا گیا ہے نہ ان کے معانی و مطالب مقصود ہیں اور نہ عقیدہ و عمل سے ان کا کوئی تعلق ہے۔

یہ بات اس بنار پر دل کو لگتی ہے کہ ابتدائے کلام میں اس قسم کے حروف لانا اہل عرب کے لئے نامانوس نہ تھے، کلام کے شروع میں کچھ حروف لانے کا رواج پہلے سے موجود تھا مثلاً لا۔ ما۔ الا۔ اما۔ بل وغیرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے کلام میں ان سے مانوس ہونے ہی کی وجہ سے نہ کسی نے سوال و اعتراض کی ضرورت سمجھی اور نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وضاحت فرمائی۔ ابتدائے کلام میں جب یہ حروف لائے گئے تو فوراً لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اسی قسم کے حروف ابتدائے کلام میں لائے گئے ہیں جو قصائد و خطبات کی ابتدا میں لائے جاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ خطبات و قصائد میں بعینہ یہی حروف اور اسی طرح لانے کا رواج زیادہ نہ تھا لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود فصاحت و بلاغت میں تمام تر کلام عرب کا پابند نہیں ہے، خطبات و قصائد، شعر و شاعری، نظم و نثر کلام کی جو بھی قسم ہو نہ کسی دائرہ میں اس کو شامل کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی کے قاعدہ و قانون اور محاورہ کا اس کو بالکلیہ پابند بنایا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اپنے اپنے دائرہ کے ایک سے ایک ماہر موجود تھے ان کو اس جیسا کلام بنا کر پیش کر دینے میں کوئی دشواری نہ ہوتی جب کہ قرآن بار بار اپنے کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں یہ چیلنج کرتا رہا کہ اگر اس میں تمہیں کوئی شبہ ہے تو اس جیسا چھوٹے سے چھوٹا کلام بھی بنا کر پیش کرو، یہ بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ لوگوں نے ہزار کوششیں کیں اور اس چیلنج کا جواب دینا چاہا لیکن مجبور ہو کر یہ کہنے پر متفق ہو گئے کہ ما ھٰذا قول البشر (یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔)

ایسی حالت میں سہل و آسان بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح قرآن نے الفاظ نظم و ضبط، فصاحت و بلاغت معانی و مطالب اور مفہوم کی گہرائی و گیرائی میں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔ اسی طرح ان حروف سے ابتدا کر کے اس نے ابتدائی کلام کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے، کسی نہ کسی درجہ (جیسا کہ اوپر گذرا) میں چونکہ اہل عرب اس طرز سے کلام کی ابتدار سے واقف تھے۔ اس بنا پر انہوں نے نہ سوال و اعتراض کی جرأت کی اور

نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو واضح کرنے کی ضرورت سمجھی ۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ حروف دو تین مدنی سورتوں کے علاوہ انہیں سورتوں کے شروع میں آئے ہیں جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں جہاں قرآن نے "کلام عرب" سے مقابلہ کا چیلنج کیا تھا ۔ مدینہ میں بھی قرآن کو چیلنج کا سامنا تھا لیکن یہ "کلام" سے زیادہ "تعلیمات" سے متعلق تھا مدینہ میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) موجود تھے اور کسی نہ کسی شکل میں تورات و انجیل کی تعلیمات باقی تھیں ظاہر ہے کہ مکہ میں ان حروف کے ساتھ کلام کو فصیح و بلیغ بنانے کی جس قدر ضرورت و اہمیت تھی مدینہ میں اتنی ضرورت و اہمیت نہ تھی ، غالباً اسی بنا پر مدینہ میں صرف دو تین سورتوں کے شروع میں ان حروف کو لانے پر اکتفا کیا گیا اور مکہ میں نازل ہونے والی ۲۶ - ۲۷ سورتوں کے شروع میں ان کو لانے کی ضرورت سمجھی گئی ۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان حروف سے شروع کرنے کا مقصد ابتدائے سورت کو فصیح و بلیغ بنا کر اس کو اعلیٰ معیار پر پیش کرنا ہے ۔

ہمارے علماء و مفسرین نے جسقدر معانی و مطالب بیان کئے ہیں وہ اس بنیاد پر ہیں کہ یہ حروف "رموز و اشارات" ہیں ۔ جن تک پہنچنے کی کوشش اہل علم کا حق ہے چنانچہ اسی بنیاد پر ان حضرات نے ان حروف تک پہونچنے کی کوشش کی اور ان کے لیے شمار اقوال کتابوں میں موجود ہیں لیکن انکو "رموز و اشارات" قرار دیکر ۔ جو کچھ کہا گیا ہے ان سب کی حیثیت محض تخمین و اندازہ کی ہے جس کے لئے کوئی مضبوط سند نہیں ہے اس بنا پر ان اقوال سے اختلاف کرنا کوئی معیوب بات بھی نہیں ہے ۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں ۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے ۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ـــــ !

اِسلام میں مقاصدِ تعلیم اور نصابِ تعلیم

از : ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

اِسلامی نصابِ تعلیم کے دو پہلو بہت اہم ہیں

(۱) تزکیّہ (۲) تسویّہ

۱۔ تزکیہ تزکیہ انسان کی خداداد صلاحیتوں اور فطری اہلیتوں کی تعلیم، تربیت اور تہذیب کرتا ہے۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما میں انسان کے داخلی و خارجی مضرت رساں عناصر کو ختم کر کے انہیں پروان چڑھاتا ہے۔ رذائل سے پاک کرتا ہے اور فضائل سے آراستہ کرتا ہے۔ انسان کی قوتِ شہوانیہ اور غضبیہ میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال اور توازن پیدا کرتا ہے۔ تزکیہ اخلاق کریمانہ کے مطابق تعمیرِ کردار اور تشکیلِ شخصیت کرتا ہے۔ انسان کو تخلیقی و تعمیری کام انجام دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ تخریب اور فساد سے روکتا اور تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے۔ تزکیہ انسان میں حریتِ فکر، اخوت و مساوات، خدمت و ایثار کے اوصاف پیدا کرتا ہے۔

تزکیہ کی اساس پر مرتبہ نصابِ تعلیم طلباء میں جذبۂ عمل کو بیدار کرتا ہے اور عمل کو راہِ راست پر قائم رکھنے کے لئے علم کے حصول کو لازم قرار دیتا ہے۔ ایسے نصابِ تعلیم کے فارغ التحصیل ترکِ دنیا اور رہبانیت سے اجتناب کرتے ہیں اور حرکت و حرارت کے عمل

کو دستورِ حیات بناتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا رھبانیۃ فی الاسلام" اسلام میں ترک دنیا کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک ارشاد گرامی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رھبانیۃ الاسلام الجھاد" اسلام کی رہبانیت جہاد ہے۔ یہ دونوں فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصاب تعلیم کے اہم رہنما اُصول ہیں۔ پہلے ارشاد کے مطابق ایسے نصاب تعلیم کی ممانعت کی گئی ہے جو طلبا کو رہبانیت و ترک دنیا، تعطل اور جمود کی طرف لے جائے۔ دنیا سے فرار اور مصائب حیات سے اجتناب کی تعلیم اسلامی نصاب تعلیم کے لئے نامانوس بات ہے۔ دوسرے ارشادِ گرامی کے مطابق اسلام میں جس رہبانیت کو جائز قرار دیا گیا ہے وہ جہاد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نصاب تعلیم میں جہاد کی رُوح کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ جہاد دو طرح کا ہے۔ ایک جہاد بالسیف تلوار کا جہاد جسکا فریضہ میدان جنگ میں ادا کیا جاتا ہے۔ دوسرا جہاد فی الحسنات ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں انجام دیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد فی الحسنات یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں جہاد کو جہادِ اکبر قرار دیا اور میدانِ جنگ کو جہادِ اصغر سے تعبیر کیا۔ ایک جنگ سے واپسی پر آپؐ نے فرمایا۔

"رجعنا من جھاد الاصغر الی جھاد الاکبر"۔ ہم جہادِ اصغر سے جہاد اکبر کی طرف پلٹے ہیں۔ آپؐ نے میدانِ جنگ میں جہاد کو اس لئے جہادِ اصغر قرار دیا کہ اس میں مجاہد ایمانی جوش و ولولہ کے تحت مختصر مدت میں غازی یا شہید کے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ جبکہ جہادِ زندگانی میں اسے طاغوتی قوتوں کے خلاف پوری زندگی مسلسل جہاد کرنا پڑتا ہے۔ جو زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔ اس موخرالذکر جہاد میں مجاہد کو اپنی مجاہدانہ جارحانہ اور مدافعانہ قوت کو ہر لمحہ جہاد کے لئے تیار رکھنا پڑتا ہے۔ اور اسے مسلسل استعمال میں لانا پڑتا ہے۔ اس لئے اس طویل المدت صبر آزما اور کٹھن جدوجہد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہادِ اکبر سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام میں رہبانیت اور جہاد کے تصور کے فرق و امتیاز کو واضح فرما دیا۔ دوسرے مذاہب میں ایک مذہبی شخص خلوت و غار میں خلوت نشینی اور انسانی روابط سے قطع تعلق کر کے جس رُوحانی لذت و سرور کے حصول کا تصور کرتا ہے مسلمان یہ اخلاقی و رُوحانی لذت و سرور عین میدانِ جنگ اور جہدِ حیات سے

حاصل کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام نے دوسرے ادیان پر فوقیت حاصل کر لی۔ کیونکہ دوسرے ادیان میں رُوحانی و اخلاقی بلندی صرف ترکِ دُنیا اور خلوت نشینی سے حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ اسلام میں لذّت و سرور بلکہ اس سے اعلیٰ، ارفع اور افضل مقام تلاطمِ حیات میں مسلمانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ بحث اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ کہ تزکیہ پر مبنی نصابِ تعلیم زیرِ تعلیم طلباء کی خداداد صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ انکی فطری استعداد کی نشوونما کی راہ میں حائل رکاوٹ کو دُور کرتا ہے اور ان میں جذبۂ عمل کی وافر قوّت پیدا کرتا ہے۔

۲۔ تسویہ اسلامی نصابِ تعلیم کا دوسرا اہم پہلو "تسویہ" ہے۔ تسویہ سے مراد مساوات و برابری ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نصابِ تعلیم کی ترتیب و تدوین ایسے انداز میں کی جائے کہ اسکے زیرِ تعلیم طلباء میں معاشرتی، معاشی سیاسی، قانونی، عدالتی، تہذیبی، تمدنی اخوّت، مساوات اور برابری کے جذبات پروان چڑھیں۔ تسویہ پر مبنی نصابِ تعلیم کے فارغ التحصیل جب ملک و ملّت کے معزز شہری بنیں تو وہ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی مساوات کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ وہ ایسا معاشرہ معرضِ وجود میں لانے کے علمبردار اور داعی ہوں جو اسلامی اخوّت و مساوات پر مبنی ہو۔

عہدِ رسالت کے نصاب میں تسویہ کو مرکزی اور محوری حیثیت حاصل تھی۔ قرآن حکیم میں ایسی آیات کثیر تعداد میں موجود ہیں جو سب انسانوں کو برابری کی تعلیم دیتی ہیں۔ اللہ کا فرمان ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۔

ترجمہ: لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے بنایا تم کو ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا، اور پھیرے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو، اللہ سے جس کا واسطہ دیتے ہو آپس میں اور خبردار رہو ناتوں سے۔ اللہ ہے تم پر مطلع۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تم کو بنایا ایک نر اور مادہ سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور گوتیں، تاکہ آپس کی پہچان ہو، بے شک عزت اللہ کے ہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا۔ اللہ جانتا ہے خبردار۔

ایسی اور بہت سی آیات انسانوں کی برابری اور مساوات کی تعلیم دیتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کے نصابِ تعلیم میں تسویہ کے اصول کو ہر سطح پر اپنایا۔ قبل از اسلام معاشی، معاشرتی، سیاسی، و قانونی طور پر جو امتیازات تھے ان سب کو ختم کر کے ایک ایسی امت پیدا کی جس میں تمام انسانوں کے حقوق برابر تھے۔ کسی شخص کو رنگ نسل، اور علاقہ کی بنیاد پر کسی دوسرے پر کوئی فوقیت و فضیلت حاصل نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نصابِ تعلیم سے فارغ التحصیل انسان اسلام کے اصولِ اخوت و مساوات کے عمدہ نمونہ تھے جیسے قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ۔ سب مومن بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اسلامی نصابِ تعلیم کے تربیت یافتہ تمام خواتین وحضرات کو جمع کر کے عالمگیر اصولِ مساوات واخوت کا اعلان فرمایا۔

" فلیس لعربی علی عجمی فضل ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی ابیض ولا لابیض علی اسود فضل الّا بالتقویٰ (خطبۃ الوحجۃ الوداع) ترجمہ: کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔

عہدِ خلافت راشدہ کے نصابِ تعلیم میں تسویہ کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ راشد نے اپنے نصابِ تعلیم میں معاشیات کے مضمون میں نظامِ تقسیمِ دولت کی بنیاد تسویہ پر قائم کی۔ تمام محدثین، مورخین، اصحابِ سیرا ور فقہا کا اس پر اجماع ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظامِ تقسیم

دولت میں چھوٹے بڑے، مرد، عورت، آزاد غلام سب کو برابر قرار دیا گیا تھا۔ فقہ حنفیہ کے عظیم امام حضرت ابو یوسف رحؒ نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذکورہ نظام کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے:۔

فقسمها بين الناس بالسوية على الصغير والكبير والحر والمملوك والذكر والانثى (صفحہ ۴۵)

حضرت ابوبکرؓ نے تسویہ کے اصول کے تحت لوگوں میں مال تقسیم کیا۔ چھوٹوں بڑوں، آزادوں، غلاموں اور مردوں عورتوں سب کو برابر برابر دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظام میں اُمّتِ مسلمہ کے تمام افراد برابر ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی مذکورہ بالا عبارت کو غور سے دیکھا جائے تو انسانوں کی کوئی قسم باقی نہیں رہتی جس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ اس میں چھوٹے بڑے افقی اور عمودی اعتبار سے سب انسان شامل ہیں۔ جس طرح ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنس کی بنیاد پر معاشی و معاشرتی طور پر مرد و عورت کے درمیان فرق و امتیاز کو ختم کر دیا۔ اسی طرح آزاد و غلام کو برابر معاشی حیثیت دیکر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی جو نظام قائم کیا تاریخ شاہد ہے کہ اسکی نظیر نہ اسلام سے پہلے موجود تھی اور نہ عہدِ حاضر کا کوئی نظام انسانی مساوات و اخوت کے اس بلند مقام کو حاصل کر سکا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تسویہ کی جگہ "تفضیل" کو اپنایا جس کے مطابق بعض کو بعض پر معاشی و معاشرتی طور پر ترجیح دی گئی۔ اس کے نتیجہ میں دولت بعض ہاتھوں میں جمع ہونے لگی۔ جس سے کنز اور احتکار کی صورت پیدا ہوئی۔ کنز و احتکار قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

(سورۃ التوبہ آیت ۳۴، ۳۵)

ترجمہ: جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں جسے وہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دو جس دن اسے دوزخ کی آگ میں دھکایا جائے گا اور ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں اسی میں داغی جائیں گی۔ یہ ہے جو تم اپنے لئے جمع کرتے تھے اب چکھو جو تم جمع کرتے تھے۔

ان نتائج کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "تفضیل" (بعض کو بعض پر ترجیح) کے نظام کو ختم کر کے تسویہ (سب کو برابر دینے) کے نظام کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے اعلان کے الفاظ یہ ہیں:۔

لئن عشت الی ھذہ اللیلہ من قبل لالحقن اخری الناس باولاھم حتی یکونوا فی العطاء سواء (ص۵۰)

اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو پچھلے لوگوں کو پہلے لوگوں کے ساتھ ملا دوں گا۔ حتیٰ کہ وہ سب معاشی طور پر برابر ہو جائیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تفضیل کے نظام کو اپنا کر عملی طور پر تجربہ کر لیا اور ثابت کر دیا کہ یہ نظام اسلامی نظام تسویہ کے خلاف اور اس سے متصادم ہے لہٰذا آپ نے تفضیل کو منسوخ کر کے اس کی جگہ تسویہ کو نافذ کرنے کا اعلان فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو شورش ہوئی اس میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ تفضیل کے نظام کو ختم کیا جائے کیونکہ اس سے نہ صرف عربوں کے مختلف طبقات میں امتیاز بڑھتا جا رہا ہے بلکہ عربوں اور عجمیوں میں اس امتیاز نے بطور خاص زیادہ تباہ کن صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ کیفیت مساوات و اخوت کی اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اس لئے تسویہ کے نظام کو اپنایا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منجملہ دیگر مطالبات کے اس مطالبہ کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا مگر آپ رضؓ شہید کر دیئے گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے پورے عہد خلافت کے دوران مسلسل تسویہ کے نظام کو اپنایا اور اسلامی تعلیمات کے مطابق معاشی، معاشرتی، اور قانونی طور پر تسویہ کو نافذ کیا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تسویہ اسلامی نصاب کی بنیادی اور مرکزی

اُصول ہے جس کے بارے میں کتاب وسنّت میں تعلیم دی گئی ہے اور جسے عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ میں عملاً نافذ کرکے نظام کی صورت میں چلایا گیا۔ اس کا تقاضا ہے کہ پاکستان کے نصاب تعلیم میں مسلمانوں میں اخوّت ومساوات پیدا کرنے کے لئے پاکستان کے نصاب تعلیم میں اسلام کے نظام تسویہ کو اساس بنایا جائے۔

اب قرآن وسنت پر مبنی اسلامی نصابِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

اسلام کا نظام تعلیم وتربیت دنیا میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ انتہائی مبارک ومسعود ہے۔ اس کی ترتیب وتدوین اور تقنین وتخطیط ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمائی۔ اس سے ملّتِ ابراہیمی اور امّتِ محمدیہ کے درمیان دینی اور روحانی گہرے روابط استوار ہوئے۔

نظام تعلیم چار بنیادی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے:

(۱) مرکزِ تعلیم (۲) طلبہ (۳) معلم (۴) نصابِ تعلیم وتربیت۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی لازوال عظمت وبصیرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظام تعلیم وتربیت کے ان چاروں عناصر کا تصوّر فرمایا اور انہیں معرضِ وجود میں لانے کے لئے اللہ تعالےٰ سے قبولیت کی دُعا فرمائی۔

(۱) تعمیرِ بیت اللہ (مرکزِ تعلیم)
(۲) تخلیقِ اُمّتِ مسلمہ (طلبہ)
(۳) بعثتِ محمّدی (معلّم)
(۴) تلاوت وتزکیہ اور تعلیم وحکمت (نصابِ تعلیم وتربیت)

۱۔ تعمیرِ بیت اللہ (مرکزی تعلیم وتربیت)

مرکزی تعلیم وتربیت کی تاسیس وقیام کیلئے

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲ - ۱۲۷)

اور جب ابراہیم اور اسماعیل وبیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دُعا کئے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما۔ بے شک

تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۔ تخلیق اُمّت مُسلمہ (طلبہ) درسگاہ بیت اللہ میں عبادت اور حصول تعلیم و تربیت کے لئے آپ نے اُمت مسلمہ کی تخلیق کے لئے دُعا فرمائی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔ (۲: ۱۲۸)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیئے اور ہماری اولاد میں سے ایک امت مسلمہ پیدا فرمایئے۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کو شرف قبولیت بخشا اور اُمّت مسلمہ پیدا فرمائی۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲: ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

۳۔ بعثت محمدی (معلّم) درسگاہ بیت اللہ میں امت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دینے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک رسول کی بعثت کے لئے دُعا فرمائی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ۔ (۲: ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار اس امت میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور امت مسلمہ میں اپنے فیض و کرم اور فضل و احسان سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ

خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

۴۔ نصاب تعلیم و تربیت امت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک نصاب تعلیم و تربیت

تجویز فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں منظوری کے لئے پیش فرمایا:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۔

وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے ۔ اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجوزہ نصاب تعلیم و تربیت کو شرف قبولیت بخشا اور اس کے مطابق امت کی تعلیم و تربیت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا ۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ط (۶۲ : ۲)

وہی تو ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے ۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۔

ان مباحث سے معلوم ہوا کہ تعمیر بیت اللہ، تخلیق امت مسلمہ بحیثیت محمدیؐ اور تجویز و ترتیب نصاب تعلیم ایک ہی مقدس و مہذب سلسلے کی مضبوط و مرصوص کڑیاں ہیں ۔ اس کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء سے ہوا اور تکمیل سید المرسلین، رحمت للعالمین اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی ۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت انہیں عناصر اربعہ پر استوار تھا ۔ جن کی تجویز و ترتیب اور تاسیس و تشکیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی ۔ اب ان چاروں عناصر کی مختصر طور پر اہمیت بیان کی جاتی ہے ۔

مرکز تعلیم انسانیت کی اوّلین عبادت گاہ اور مرکز تعلیم و تربیت بیت اللہ شریف ہے ۔ اسے دُنیا کے تمام مراکز اور درسگاہوں پر جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے قرآن نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے :

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۹۶ : ۳)

یہ گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہی ہے جو مکّے میں ہے مبارک اور دنیا کے لئے موجب ہدایت ۔

اس آیت میں بیت اللہ کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں (۱) مبارک (۲) ہدی للعالمین ایک جگہ بیت اللہ کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس میں داخل ہونے والے کو امن وسکون نصیب ہوتا ہے ۔

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۔(۳:۹۷) جو اسمیں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔

ایک جگہ بیت اللہ کو انسانیت کی اجتماع گاہ اور امن گاہ قرار دیا گیا ہے ۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۔ (۲ : ۱۲۵) اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔

قرآن وسنّت اور سیرت وتاریخ میں بیت اللہ کی اور بھی کئی صفات بیان ہوئی ہیں ، مذکورہ آیات میں بیت اللہ کی صفات یہ ہیں :

مبارک ہدی للعالمین ، اجتماع گاہ انسانیت اور امن گاہ انسانیت ، ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی تعمیر فرمائی ۔ یہ مسلمانوں کا دوسرا بڑا تعلیمی و روحانی مرکز قائم ہوا ۔ اور یہ بھی انسانیت کے لئے برکت ہدایت اجتماع اور امن کا موجب ثابت ہوا ۔ اسی طرح جیسے جیسے انسانیت دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئی اور اسلام اکناف واطراف عالم میں پھیلتا چلا گیا ویسے ویسے ان اولین اسلامی تعلیمی و روحانی مراکز کی طرز پر تعلیم وعبادت گاہیں قائم ہوتی چلی گئیں مسلمانوں کی درسگاہیں بابرکت ہوتی تھیں کیونکہ ان کے پاس سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خلوص ، نیک نیتی اور تقویٰ کی بنیاد پر ان کی تعمیر کرتے تھے ۔ ان میں رشد وہدایت کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ ان میں برکت وہدایت کی موجودگی انسانیت کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور متلاشیان حق اور تشنگان علم جوق در جوق ان اجتماع گاہوں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے ۔ ان کا پرامن اور پرسکون ماحول علم وتحقیق کے لئے مہمیز اور تعقل وتفکر کے لئے تحرک وحرارت کا باعث بنتا تھا ۔

درحقیقت اسلامی درسگاہوں میں برکت اور ہدایت کا ماحول طلبہ کی خداداد

صلاحیتوں کو ابھرنے پر آمادہ کرنا، اور امن و اجتماع کی معتدل خوشگوار اور سازگار فضا انہیں بڑھنے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کے وسیع تر اور وافر مواقع فراہم کرتی تھی۔ مسجد نبوی بطور درسگاہ نظم و نسق کے اعتبار سے، مثالی امن و سکون کے اعتبار سے نمونہ برکت و ہدایت کے اعتبار سے بے مثل صحابہ کرام علوم و فنون کی ہر نوع کا علم حاصل کرتے۔ مختلف مسائل حیات پر اجتہاد و تحقیق کی تربیت پاتے، تلاش و جستجو کی تڑپ کے تحت بہت سے علمی فکری، اور تحقیقی سوال کرتے۔ اس آزاد علمی ماحول میں ان کی علمی و فکری تربیت ہوئی۔ درسگاہ میں نظم و ضبط کا سب سے بڑا اور اہم ترین قاعدہ اور قانون معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور سیرت و کردار تھا۔ جبر و اکراہ اور تحکم و تسلط کی جگہ معلم کی اخلاقی قوت اور اسکی ذات کی عظمت و رفعت تھی۔ یہ فضا صحابہؓ کی صفات عالیہ کو پروان چڑھاتی اور شر و فساد کو دخل اندازی کا موقع نہ دیتی۔

ان اسلامی درسگاہوں اور ان کے اوصاف و صفات کا موازنہ جب عہد حاضر کی درسگاہوں سے کیا جاتا ہے تو ان کے مقصد و مدعا، ان کے ماحول اور انکی فضا کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا۔ عہد نبویؐ کے تعلیمی و روحانی مراکز کی صفت قرآن نے یہ بیان کی ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى — مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ (۹ : ۱۶۸)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری درسگاہوں کی بنیاد بھی تقویٰ ہی پر ہے۔ کیا ان کا مقصد و مدعا اور ان کا ماحول اور فضا وہی ہے جو عہد نبوی کی تعلیم گاہوں کی تھی؟ آج دو قسم کی درسگاہیں قائم ہیں آج جدید تعلیم کی درسگاہیں اور دوسری قدیم نظام تعلیم کی درسگاہیں، جدید نظام تعلیم کی درسگاہوں کا اصل الاصول تو مغربی فکر و فلسفہ ہے اگرچہ فروعات میں "لازمی دینیات" کے نام سے بھی ایک مضمون مختلف تعلیمی سطحوں پر شامل نصاب ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اپنی مبادیات اور قواعد و کلیات کے اعتبار سے اسلامی معاشرت، تہذیب و تمدن، نفسیات اور دین و عقیدہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ حال ہی اشتراکیت و اشتمالیت نے بھی ہماری درسگاہوں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔

اس صورتحال سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان درس گاہوں کے سامنے ملک و ملت کے حوالے سے کوئی بنیادی مقصد و مدعا موجود نہیں - اس نظام کے داعی اس کے حق میں اگر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں تو فقط یہ کہ اس سے خواندگی کی شرح بڑھتی ہے اور نوکری مل جاتی ہے اور بس - اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہماری درسگاہوں کا مقصد و مدعا ہی متعین نہیں تو ان میں برکت و ہدایت اور اجتماع و امن کا ماحول کیسے پیدا ہو - اور اگر ان میں انتشار و افتراق فساد و طغیان اور قتل و بغاوت ہے تو یہ اسی صورت حال کا منطقی نتیجہ ہے - اگر وہ مبارک کی جگہ نامبارک، ہدایت کی جگہ ضلالت، اجتماع کی جگہ انتشار اور امن کی جگہ فساد کا نقشہ پیش کرتی ہیں تو یہ نتیجہ ہے اس نفاق کا جو تقویٰ کی جگہ ان درسگاہوں کی بنیاد ہے اور بغاوت ہے نوجوان نسل کی اس طبقہ کے خلاف جو اس نظام پر حاوی ہے جو یا تو نفاق کی وجہ سے مثبت تبدیلی کے حق میں نہیں یا نااہلیت کے سبب بہتر نظام کے قیام کے قابل نہیں -

دوسری درسگاہیں قدیم نظام تعلیم کی درسگاہیں ہیں جس میں عربی اور مذہبی نصاب تعلیم رائج ہے مگر عملاً بحیثیت مجموعی فرقہ واریت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے - عہد مغلیہ میں یہ نظام رائج ہوا اسی وقت اس میں ریاضی، طب، تاریخ، معاشرتی علوم، انجینئرنگ انتظامیہ، عدلیہ کی تعلیم شامل نصاب تھی - برطانوی عہد میں اس نصاب کا وہ باب خارج کر دیا گیا جو امور مملکت اور معاشرت سے متعلق تھا اور معاملات کے ابواب عملاً متروک ہو گئے یہ نصاب صرف عبادات تک محدود ہو کر رہ گیا قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اس کی یہی کیفیت ہے اس سے پیدا ہونے والے لوگ عبادات کی تفصیلات و جزئیات کے ماہر ہوتے ہیں مگر دنیوی معاملات اور امور مملکت سے نابلد ہوتے ہیں یہ درسگاہیں فرقہ واریت کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہیں - اپنے اپنے فرقے کی عصبیت طلبہ میں پیدا کی جاتی ہے -

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مختلف فرقوں کی درسگاہوں کے احاطوں میں امن و سکون رہتا ہے مگر ان کے فارغ التحصیل جب مستند ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کشیدگی پائی جاتی ہے جس کا اندازہ مساجد و محافل کے مختلف اجتماعات اور عبادت گاہوں پر قبضہ کرنے سے ہوتا ہے -

ہماری جدید و قدیم درسگاہوں کو بامقصد و تعمیری خطوط پر قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ

ہے اور وہ یہ کہ ان کی بنیاد قرآن حکیم کی رہنمائی میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی و رُوحانی درسگاہوں کی طرح تقویٰ پر رکھی جائے۔ انہیں برکت و ہدایت کا سرچشمہ اور امن و اجتماع کا مرکز بنایا جائے۔

طلبہ طلبہ نظام تعلیم کا انتہائی اہم عنصر ہیں۔ حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طلبہ صحابہ کرامؓ تھے ان کی صفات قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ میں موجود ہیں۔ جن کے سرسری مطالعہ سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد اپنی سیرت کی تشکیل، کردار کی پختگی، دنیوی امور میں مہارت اور اُخروی منافع کا حصول تھا۔ خشیتِ الٰہی کے تحت حقوق و فرائض کی تعین اور ادائیگی میں توازن اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ایثار، قربانی محبت شفقت ہمدردی غمگساری محنت دیانت قابلیت سے کام لینا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لئے انتہاء درجے کا شوق و ذوق محنت و مشقت احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ان کے اوصاف تھے۔

قرآن حکیم نے عقل و فکر، تدبر و تعقل پر بڑا زور دیا ہے یہی وجہ ہے کہ عہد نبویؐ کی درسگاہوں میں اندھی تقلید اور جمود کی جگہ اجتہاد کا دور دورہ تھا۔ صحابہ کرامؓ اپنی ذہنی و فکری، قلبی اور رُوحانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے۔ ان میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال تھا۔ دینی اور دنیوی امور میں توازن تھا۔ علوم و فنون میں انہماک انہیں اپنے خالق و مالک کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتا تھا، اور زہد و تقویٰ دنیوی امور میں مہارت کے مانع نہیں ہوتا تھا۔ ان کے سامنے نظامِ تعلیم کا مقصد و مدعا واضح تھا۔ اس لئے وہ اس کے حصول کے لئے ہمہ تن مصروف و مشغول رہتے۔ اپنی تمام توانائیاں اس کو حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیتے اور پورے امن و سکون کے ساتھ حصول علم میں لگے رہتے، پوری دلجمعی کے ساتھ اعلیٰ مقاصد کا حصول ان کا مطمع نظر ہوتا بلند و بالا امور کی طلب و جستجو کی لگن کے سبب غیر ضروری، فضول اور بیکار کاموں کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہ تھا۔

یہی وہ صفاتِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ تھیں جن کی بدولت قلیل ترین مدت میں صحابہ کرامؓ نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے فقہ و قانون میں وہ اجتہادات کئے جن کی روشنی انسانیت کو آئین و قوانین کی ترتیب میں ہمیشہ راہ

دکھاتی رہے گی ۔ تعمیر و تشکیل شخصیّت میں انہوں نے ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک انسانوں کے لئے رہبر و رہنما کی حیثیت سے موجود رہیں گی ۔ علم و فضل اور عقل و تدبر کے ایسے شاہکار سامنے لائے جو تاریکی و جہالت سے نکلنے والوں کے لئے مشعل کا کام دیتے رہیں گے ۔ طلباء درسگاہ عہد نبویؐ اور طلباء عہد حاضر کے موازنے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ان میں انتہائی بُعد ہے ۔ ان میں شوق و ذوق اُن میں لاپرواہی و بے رغبتی ان میں اجتہاد و جستجو اُن میں جمود و بے اعتنائی اُن میں مقصد و مدعا کے حصول کی تڑپ ان میں مقصد و مدعا کی بے یقینی وہ تعمیر کے لئے بے قرار یہ تخریب کے لئے بے چین وہ سراپا ادب و احترام یہ نمونہ توہین و تحقیر یہ لازم نہیں کہ اب ایسے مخلص محنتی اور با مقصد طلباء بالکل مفقود ہیں ایسا ہرگز نہیں ایسے طلبہ موجود ہیں اور ان پر قوم کو فخر ہے ۔ البتہ قابل غور امر یہ ہے کہ اس وقت کس ذہنیت کا غلبہ ہے ؟ اور تخریب و انتشار کا رُخ تعمیر و سکون کی طرف کس طرح موڑا جاسکتا ہے ۔ میری سمجھ میں صرف ایک ہی بات آتی ہے کہ طلبہ میں صفات صحابہ کرام پیدا کی جائیں ۔ ان کے سامنے درسگاہ نبویؐ کے تلامذہ کا نقشہ پیش کیا جائے ان میں جوشِ عقیدہ پیدا کیا جائے اور اس عقیدہ کے مضمرات ان کے عمل اور سیرت و کردار کا روپ دھارتے چلے جائیں ۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ صحابہ کرامؓ کے علمی کارنامے اور حصولِ علم میں ان کی جدوجہد اور مصائب و آلام کی برداشت پر مبنی نصاب تیار ہو ۔

معلّم نظام تعلیم و تربیت میں معلّم کو مرکزی و محوری حیثیت حاصل ہوتی ہے اسلامی نظام تعلیم کے اوّلین معلّم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔ آپؐ کا ارشاد ہے :۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ہ مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے ۔

اس منصب پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے آپؐ نے اپنی قبل از نبوّت سیرت و کردار کے بارے میں اپنے اہل شہر سے دریافت فرمایا کہ میں آپ لوگوں میں زندگی بسر کرچکا ہوں ۔ آپ نے مجھے کیسا پایا ؟ سب لوگوں نے شہادت دی کہ ہم نے آپؐ کو ہمیشہ صادق و امین پایا ۔ ہم نے آج تک آپؐ سے سوائے سچ کے کچھ نہیں سنا ۔ اہل شہر کی اسی شہادت کو قرآن حکیم نے اس آیت کریمہ میں بیان کیا ہے ۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا ہ میں قبل ازیں تم میں ایک عمر گذار

قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ چکا ہوں کیا تم سمجھتے نہیں -

آپؐ کے خلقِ عظیم کی شہادت سب سے آخری آسمانی وحی قرآن حکیم نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے :

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ آپ یقیناً خلق عظیم رکھتے ہیں -

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصب نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا :

بعثت لاتمم حسن الاخلاق میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمی کے فرض کو جس حسن وخوبی سے انجام دیا وہ ایک ابدی وسرمدی نمونہ عمل ہے - اس فریضے کی انجام دہی کے لئے آپؐ نے جس خلوص جذبے محنت، محبت اور ہمدردی کو اپنایا اللہ تعالےٰ نے اسے انتہائی بصیرت افروز انداز میں اس آیت میں بیان فرمایا -

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا - اے پیغمبرؐ ! اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپؐ ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں

جب تک معلم کو اپنے مقصد ومشن کے ساتھ ایسی ہی وابستگی نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں تعلیم وتبلیغ کے منصب پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ، اعمال اور سیرت وکردار کا جو نمونہ بحیثیت مجموعی نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے - اسے قرآن حکیم نے تمام انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور قیامت تک تعلیم وتبلیغ سے وابستہ انسانوں کو اسے اپنانے کا حکم دیا ہے - چنانچہ قرآن حکیم کی تعلیم ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ - تحقیق تمہارے لئے اللہ کا رسولؐ بہترین نمونہ ہے -

تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ معلمین اسلام نے فرائض تعلیم سنبھالنے سے پہلے اپنی سیرت وکردار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالا - پورے جذبے ، شوق اور مشن کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کی بکمال خلوص ، محنت

اور جانفشانی اپنے تلامذہ میں علم و ہنر کی جستجو اور تحقیق و اجتہاد کی تڑپ پیدا کی ۔

عہد حاضر میں اخلاق و کردار کی پستی اور سیرت و اعمال کی گراوٹ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بحیثیت مجموعی اس کی تہہ میں معلّمین کا کردار پوشیدہ ہے ۔ انکی مقصد و مدعا سے لاپرواہی، محنت و جانفشانی سے پہلوتہی، طلبہ سے بے رغبتی، وہ عوامل ہیں جن کا پرتو ان کے زیر تعلیم طلبہ کی ذات و شخصیت پر پڑتا ہے ۔ جب تک معلّمین اپنی سیرت و کردار اور اعمال و افعال کو اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ڈھالتے اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ کردار کو طلبہ کے لئے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے اس وقت تک قومی و ملّی اخلاقی گراوٹ کا رخ تعمیر و ترقی کی طرف نہیں موڑا جا سکتا ۔

نظام تعلیم سے وابستہ معلّمین کے لئے لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ " وانك لعلى خلق عظيم " اور آپ کے کردار " فلعلك باخع نفسك علیٰ آثارهم ان لم يومنوا بهذا الحديث اسفا " کو اپنائیں اور اس کے مطابق تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیں ۔

نصاب تعلیم و تربیّت قرآن حکیم کی سورہ بقرہ، آل عمران اور جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد اور آپ کی نبوّت اور رسالت کے فرائض منصبی بیان ہوتے ہیں ۔ انہیں مقاصد نبوّت کے مطابق آپ نے امّت مسلمہ کی تعلیم و تربیت فرمائی اور انہیں بنیادی تعلیمی اصولوں پر عہد نبوی کا نصاب تعلیم و تربیّت مشتمل تھا ۔

۱ ۔ تلاوت آیات (يتلوا عليهم اٰيٰتك)
۲ ۔ تعلیم کتاب (ويعلمهم الكتاب)
۳ ۔ تعلیم حکمت (والحكمة)
۴ ۔ تزکیۂ نفس (ويزكيهم)

تلاوت آیات سب سے پہلے تلاوت آیات کو لیجئے ۔ امام راغب اصفہانی تلاوت کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

والتلاوة تختص باتباع كتب الله المنزلة — تلاوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتب کی اتباع کیلئے مخصوص ہے

اس کے ساتھ ہی تلاوت کا یہ معنی بھی ہے ۔

یقال فی القرآن فی شئ	قرآن حکیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب
اذا قرأته وجب علیک	تو نے اس میں سے کچھ پڑھا تو تیرے
اتباعه ۔	اوپر اس کی اتباع واجب ہوگئی ۔

تلاوت سے مراد قرآن کریم کی اوامر و نواہی اور احکام و تعلیمات کی تلاوت، ان پر عمل کے نقطۂ نظر سے کرنا ہے ۔ تلاوت کے دو مفہوم ہیں :

(۱) قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور ان کا تقدس ۔

(۲) قرآنی احکام و قوانین اور اخلاقی و روحانی تعلیمات کی اتباع ۔

اس سے ظاہر ہے کہ "یتلوا علیہم اٰیٰتک" کا مفہوم یہ ہوا کہ قرآنی آیات کو عام کیا جائے ۔ انہیں نہایت دلسوزی کے ساتھ تلاوت کر کے ذہن نشین کیا جائے، قلب و روح پر ان آیات کو نقش کیا جائے ، ملک و معاشرے میں موجود ہر فکر و فلسفہ پر ان آیات کا غلبہ ہو شعر و ادب پر قرآنی آیات کی چھاپ ہو ۔ معاشرے میں تمام افکار و خیالات ان کے تابع ہوں ۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کا چرچا ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے وصال تک مسلسل اسطرح تلاوت فرمائی کہ قرآنی آیات روزمرہ کا موضوع بن گئیں ۔ موافق و مخالف سب انہیں کے متعلق گفتگو کرتے ۔ آپ نے تلاوت کے ذریعے قرآن کو اتنا عام کر دیا کہ قبل از اسلام کا شعر و ادب دب کر رہ گئے ۔ ہر جگہ ہر مقام پر قرآنی آیات کا چرچا ہونے لگا حتیٰ کہ قبل از اسلام عرب تہذیب و ثقافت کا سرمایا "سبع معلقات" بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور ان کی جگہ قرآنی آیات نے لے لی ۔

آج اگر عہد نبوی ؐ کے نصاب تعلیم کے پہلے جزو "تلاوت آیات" پر مبنی ملک کے نظام تعلیم کو ترتیب دیا جائے تو نہایت صدق اور اخلاص کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں "تلاوتِ آیات" کو نصاب تعلیم میں پوری پوری اہمیت دینا ہوگی ۔ ایک مقررہ مدت کے اندر اندر ملک کے ہر فرد میں تلاوتِ آیات کی استعداد پیدا کرنا ہوگی ۔ اس کا عملی طریق کار یہ ہو سکتا ہے ۔

(۱) ہمارے نظام کے درجہ ابتدائیہ (پرائمری) میں پورے قرآن کی ناظرہ تعلیم

لازمی قرار دی جائے تاکہ ملک کے ہر پرائمری پاس بچے میں پورے قرآن حکیم کو ناظرہ طور پر پڑھنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

(۲) اس سلسلے میں دوسرا قدم یہ اٹھایا جائے کہ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ مختلف موضوعات کے تحت آسان اور عام فہم اردو زبان میں طلبہ کو پڑھایا جائے۔

تعلیم کتاب عہد نبوی کے نصاب کا دوسرا بڑا اصول تعلیم کتاب ہے۔ کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری وحی کتاب اللہ وہ قرآن حکیم" ہے۔ اس کی تعلیم سے مراد اس کے احکام، تعلیمات، ارشادات، ہدایات اوامر و نواہی کی تعلیم ہے۔ پوری کتاب کو سمجھنا اس کے معانی و مفاہیم کو جاننا، اس میں دیئے گئے احکام کا علم حاصل کرنا اس کی تعلیمات ارشادات اور ہدایات کا فہم و ادراک پیدا کرنا اس کے اوامر اور نواہی کو سیکھنا، تعلیم کتاب ہے۔ قرآن حکیم خالق کی طرف سے مخلوق کے لئے آخری مکمل، تمام، کمال، غیر متغیر، غیر متبدل، ابدی، سرمدی ہدایت ہے ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اسے پڑھے، اسے سیکھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے۔ تعلیم کتاب میں فرد سے زیادہ معاشرے پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے۔ عام حالات میں ہر فرد کو خود بخود تعلیم کتاب کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم معرض وجود میں لائے جس کی بنیاد، تعلیم کتاب پر ہو۔ قرآنی آیات کو پڑھنا اور انکی تلاوت کرنا تلاوت آیات ہے۔ تعلیم کتاب سے مراد ان آیات میں دی گئی تعلیمات کو سیکھنا، انہیں جاننا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ تلاوت کے علاوہ قرآنی آیات کا معنی اور مفہوم سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملک و ملت کے ہر فرد کو اس کا اہل بنانا کہ وہ قرآن حکیم کی جملہ تعلیمات کو سمجھ سکے اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنے اس فریضہ کو اپنی حکومت کی وساطت سے انجام دیتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حکومت پر اس فریضہ کی اوّل انجام دہی عائد ہوتی ہے۔ حکومت تمام مسلمانوں کے لئے "تعلیم کتاب" کا اہتمام اپنے نظام تعلیم کے ذریعے کر سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارک

مسجد عہد میں جو نصاب تعلیم ترتیب دیا تھا۔ اس میں تعلیم کتاب ہی کو بنیادی، محوری اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آپؐ کی حکومت کے جملہ ذرائع و وسائل تعلیم کتاب کیلئے وقف تھے۔ سربراہ حکومت اور تمام اعیان و اعزان مملکت تعلیم کتاب میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے خصوصی تربیت گاہیں برائے اساتذہ قائم فرمائیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کو ملک کے طول و عرض میں تعلیم کتاب کے لئے مامور فرمایا۔ مسجد سب سے بڑی درسگاہ قرار پائی۔ ملک کی تمام مساجد تعلیم کتاب کے لئے وقف تھیں۔ اور تمام مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہوں اور کتاب کا علم حاصل کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کا نظام تعلیم ایک مثالی نظام تھا۔ اس نظام کے ذریعے ہر مسلمان میں اتنی استعداد پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام اس کی کتاب قرآن حکیم کو پڑھ کر خود سمجھ سکتا تھا۔ کتاب اللہ کی اس وسیع پیمانے پر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست، عدالت، حکومت، تہذیب تمدن، ثقافت، نہایت آسانی، دل رغبت اور سہولت کے ساتھ اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے۔ تعلیم کتاب مسلمانوں کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوئی اور مسلمان کتاب اللہ کی تعلیمات کے زیر اثر انسانیت کے لئے نمونہ بن گئے۔ ان کے اعمال، افعال، سیرت، کردار، تہذیب اور اخلاق انسانیت کے لئے معیار قرار پائے۔ اللہ تعالےٰ کی کتاب کو سیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ نظام حکومت کو چلانے والے عمال اور حکام دیانت، امانت، محنت اور خدمت کا شاہکار بن کر سامنے آئے۔ عوام صدق، خلوص ایثار، ہمدردی، اخوت محبت، اتحاد و اتفاق کا مجسمہ بن کر دوسری انسانیت کے سچے محسن و غم خوار ثابت ہوئے۔ شعر، فساد، فحش، منکر، مغلوب ہو گئے اور خیر و معروف، صلاح، فلاح غالب ہو گئے۔ بزدلی چوری، دغا، فریب، مکاری، عیاری، کی جگہ شجاعت، اولوالعزمی، بلند ہمتی، عزم صمیم، صدق اور خلوص اسلامی معاشرت کا طرۂ امتیاز قرار پائے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو صرف ایک درست قدم اٹھانے سے برآمد ہوئے اور یہ درست قدم تعلیم کتاب کو نظم تعلیم کا مرکز قرار دینا تھا۔

"تعلیم کتاب" کو موجودہ نظم تعلیم میں رائج کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ درجہ ثانویہ (میٹرک) تک اسے لازمی قرار دیا جائے۔ ان پانچ سالوں میں "تعلیم کتاب" کو اس طرح نصاب کا حصہ بنایا جائے کہ میٹرک پاس کرنے تک ہر طالبعلم لازمی طور پر

قرآن مجید کا ترجمہ سیکھ جائے اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ جائے۔ جس طرح حصہ پرائمری میں پورا قرآن ناظرہ پڑھا دیا جائے۔ اسی طرح حصہ میٹرک میں پورے قرآن کا ترجمہ سکھا دیا جائے۔

تعلیم حکمت قرآنی نصاب تعلیم و تربیت کا تیسرا بڑا اصول تعلیم حکمت (والحکمۃ) ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا۔ حکمت سے مراد دین کی معرفت اس کی فقہ اور اسکی اتباع ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حکمت سے مراد سنّتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ کتاب سے مراد قرآنی احکام ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و شرائع کی حکمت اور ان میں انسانیت کے لئے مصالح و منافع کا بیان ہے۔ ان آئمہ مجتہدین و مفسّرین کی آراء سے ظاہر ہوا کہ قرآنی نصابِ تعلیم کا اصول "والحکمۃ" ایک نہایت جامع اصطلاح ہے۔ جس میں وہ تمام علوم سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق کتاب و سنّت کی تعلیم سے ہے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دینی و دنیوی امور پر مشتمل ہر وہ چیز جو دُنیا و آخرت میں انسانیت کے لئے فائدہ مند اور نفع بخش ہے ان تعلیمات میں موجود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت اسرار و رموز دین الٰہی کی گرہ کشائی بھی ہے اور کتاب و سنّت کی تعلیم سے موافق اور انکے مطابق تمام علوم و فنون بھی ہیں۔ یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب سنّتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے آپ کے ارشادات، فرمودات، تقاریر، اقوال، افعال و اعمال پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ قانون، تعلیم، حکمت، عدالت معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب و تمدن، کی تشکیل اور اخلاق و کردار کی تعمیر سب حکمت کی عمدہ تفسیر ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ تمام معاشرتی و سائنسی علوم جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں اور وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے موافق ہیں وہ سب اسلامی ہیں اور انکی تحصیل ضروری ہے۔

حکمت رُوح دین ہے اسے موجودہ نظام تعلیم میں بی۔ اے، بی۔ ایس سی تک پڑھایا جائے قرآن کی تعلیمات کی غایت اور انکی رُوح پر مبنی نصاب تیار کرکے نظام تعلیم کے جملہ شعبہ جات کی گریجویٹ سطح پر نافذ کیا جائے۔ نصاب حکمت کی ترتیب و

تدوین میں امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، ابن خلدونؒ، امام شاہ ولی اللہؒ، علامہ اقبال کی خدمات سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ میٹرک کی سطح تک تلاوت و تعلیم کتاب کے بعد گریجویٹ سطح تک تعلیم حکومت کے اہتمام کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس مجوزہ نظام تعلیم سے پیدا ہونے والے ڈاکٹر، انجنیئر، ماہرین، معاشیات، سیاسیات، معاشرت، عدالت، تعلیم، پوری طرح کتاب و سنت سے سرشار ہوں اطراف و اکناف عالم میں پھیل جائیں وہ جہاں کہیں جائیں اسلام کے مبلغ ہوں۔ ان کے اخلاق و کردار خود سراپا دعوت اسلامی ہوں۔ یہی وہ طریق تعلیم ہے جو مغربی استعمار سے قبل اسلام میں رائج تھا۔ اس کے فارغ التحصیل تاجر بھی مبلغ تھے، اس وقت کروڑوں اسلام کے نام لیوا انہیں مبلغین اسلام کے مرہون منت ہیں۔

تزکیہ نفس اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا چوتھا بنیادی اصول تزکیہ نفس ہے۔ (ویزکیھم) تعمیر سیرت و کردار میں تزکیہ نفس کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ اذہان و قلوب کی تمام اخلاقی بیماریاں، نیتوں اور ارادوں کے تمام فسادات کا علاج تزکیہ نفس ہے۔ سرکاری عدالتی، تعلیمی، سیاسی معاشرتی، جملہ امراض اور انکے انسداد و تدارک کا واحد حل تزکیہ نفس ہے۔ عہد رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی گمراہ، بدعنوان اور حیوانی صفات و اوصاف کی حامل قوم کو تزکیہ نفس کے ذریعے دنیا کی سب سے بڑی با اخلاق، مہذب، متمدن اور صاحب سیرت و کردار قوم بنا دیا تھا۔ خلفائے راشدین نے اسلام کے نظام تعلیم اور اس کے بنیادی اصول تزکیہ نفس کی بدولت ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ کے انسانوں کو انسانیت سکھائی اور بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

تزکیہ نفس کا عمل نظام تعلیم کے تمام مدارج کا لازمی جز ہونا چاہیئے۔ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ جو لوگ سمجھے بغیر قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں وہ تو یقیناً اس کا واضح اثر قبول کرتے ہیں۔ مگر تزکیہ کا تعلق علم و تعلیم کی بجائے عمل سے زیادہ ہے۔ تلاوت اور تعلیم کتاب و حکمت کا تعلق تو تدریس سے ہے مگر تزکیہ کا تعلق خالصۃً عمل سے ہے۔ تزکیہ نفس میں معلم کی ذات، سیرت و کردار اور نمونہ عمل بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔

اُستاذ ایک طرف قرآنی تعلیمات کی تدریس کے فرائض انجام دے اور دوسری طرف ان تعلیمات کا عملی مجسمہ بن کر اپنی سیرت و کردار کے اعلیٰ عمدہ اور پاکیزہ نقوش طلبہ کے صاف اذہان و قلوب پر ثبت کرے۔ قرآن کریم میں تطہر اور تزکیہ کی اصطلاحات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ تطہر کا مفہوم یہ ہے کہ رذائل سے اجتناب اور فضائل سے آراستگی معلّم کے فرائض منصبی کا لازمی جز ہے۔ تزکیہ نفس کا مطلب ترک دُنیا ہرگز نہیں۔ دنیا میں تزکیہ نفس کی افضل و اکمل ترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی بھرپور زندگی آنحضرتؐ نے گذاری دُنیا میں اسکی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنہ۔

تربیّت گاہیں عہد نبویؐ کے نظام تعلیم و تربیت کا جو اجمالی خاکہ پیش ہوا اور اسکی روشنی میں موجودہ نظام تعلیم کی ترتیب و تدوین نو کے لئے جو تجاویز پیش ہوئیں ان پر عمل کی صورت میں آئندہ نسل کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے مگر موجودہ نسل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرز پر مدون و مرتب نظام تعلیم کے لئے اساتذہ کہاں سے میسّر آئیں جو انہیں تقاضوں کے پیش نظر یہ تجویز ہے کہ اس نظام کا نقطۂ آغاز تربیت گاہیں قرار دی جائیں۔ اس وقت ہر درجہ تعلیم میں تعیناتی سے قبل اساتذہ کو تربیت قبل از ملازمت دی جاتی ہے۔ اگر ان تربیت گاہوں کو فعال بنا کر انکے نظام تعلیم و تربیت کو دینی و ملّی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک مختصر مدّت میں مطلوبہ معیار و قابلیت کے اساتذہ ہر سطح تعلیم پر میسّر آسکتے ہیں۔

اس مقصد کا حصول تین اہم امور پر منحصر ہے:

اوّل۔ تربیت گاہوں کو تعلیم گاہوں پر ترجیح دیجائے قابل ترین، دیانتدار محنتی اور جوش عمل اور عقیدہ سے سرشار اساتذہ کو تربیّت گاہوں میں مقرر کیا جائے اس صورت میں اگر ایسے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ مراعات بھی دینی پڑیں تو ان سے دریغ نہ کیا جائے تاکہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ مستقبل کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔

باقی ص۵۸ پر

سیرت وسوانح | (قسط نمبر ۳)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ

نصرت علی اثیر

تفسیر قرآن اور عبداللہ بن مبارکؒ

حضرت عبداللہ بن مبارک کی شخصیت علم وعمل کے اعتبار سے ایک مثالی زندگی تھی۔ آپ کو حدیث، عربی ادب، تاریخ اور لغت پر مکمل عبور تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی میں ورع، تقویٰ، دیانتداری، خوفِ آخرت اور زہد وعبادت بھی کمال درجے کی تھی۔ جیسا کہ آپ کی وفات کے بعد جب آپ کے معاصرین میں سے کچھ اکٹھے ہوئے اور آپ کی خوبیاں گننے لگے تو انہوں نے بالاتفاق کہا:

"اجمع العلم والفقہ والادب	یعنی آپ علم، فقہ، ادب، نحو، لغت
والنحو واللغۃ والزھد	زہد، شعر، فصاحت، ورع، انصاف
والشعر والفصاحۃ والورع	تہجد گزاری اور عبادت، صحتِ فکری،
والانصاف وقیام اللیل	غیر ضروری باتوں میں کم بولنا اور اپنے
والعبادۃ والسلامۃ فی	احباب سے کم اختلاف کرنے کی
رایہ قلۃ الکلام فیما	جملہ خصوصیات کے جامع تھے۔
لا یعنیہ وقلۃ الخلاف	
علی اصحابہ" [۲۴۷]	

اسی طرح عباس ابن مصعب فرماتے ہیں۔ [۲۴۸]

"جمع ابن المبارک الحدیث — حضرت عبداللہ بن مبارک نے حدیث

---

[۲۴۷] قرشی : جواہر المضیہ : ۱ : ۲۸۱ مطبوعہ ہند ۱۳۳۲ھ

[۲۴۸] ذہبی : تذکرۃ الحفاظ : ۱ : ۲۵۳

والفقه والعربیه و	حدیث، عربی، تاریخ، شجاعت،
ایام الناس والشجاعة	والسخا اور مختلف گروہوں کی آپ
والسخا ومحبة والفرق	سے محبت جیسی خصوصیات کو اپنی شخصیت
له "	کے اندر باہم جمع کر دیا تھا۔

عمر رضا کحالہ آپ کی حیثیت کی تشریح یوں کرتے ہیں : [۲۴۹]

" عبداللہ بن مبارک بن واضح الحنظلی المروزی.... ایک عالم فقیہہ، محدث، مفسر، مؤرخ، نحوی، لغوی اور صوفی تھے۔ "

مندرجہ بالا اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کمالات اور ضروری خصوصیات جو ایک مفسر کے لیے ضروری ہو سکتی ہیں۔ آپ کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ داؤدی نے اپنی کتاب " طبقات المفسرین " میں آپ کو ثقہ، معتبر، فقیہہ، جیّد عالم اور مجاہد جس میں بھلائی کی جملہ خوبیاں پائی جاتی ہیں، کے اوصاف سے متصف کرتے ہوئے مفسرین میں شمار کیا ہے۔ [۲۵۰] آپ نے ایک تفسیر لکھی جس کا ذکر کئی اہلِ تذکرہ نے کیا ہے۔ اس کا ذکر بعد میں آپ کی تصنیفات کے ضمن میں بھی آئے گا۔ یہ تفسیر آج کل مفقود ہے۔ اس لیے اس کی ترتیب و تدوین کے بارے میں کچھ پتہ نہیں لگتا۔ اہلِ تذکرہ نے بھی اس کی تفصیلی صورت پیش نہیں کی۔ لیکن آپ کے علم کی وسعت اور گراں قدر تصنیفی کمالات کے پیشِ نظر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ایک تفسیر کی جملہ خصوصیات ضرور پائی جاتی ہوں گی۔ علاوہ ازیں آپ کے کئی تفسیری اقوال تفسیر ابن ابی شیبہ اور دیگر مفسرین کی تفاسیر میں بکھرے ملتے ہیں۔

علومِ حدیث اور عبداللہ بن مبارکؒ

حضرت عبداللہ بن مبارک ایک جیّد محدّث تھے۔ آپ کو باقی علوم کی نسبت علمِ حدیث سے زیادہ وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔ آپ نے صحابہ کرام رضہ اور تابعین عظام کی کتب کو

---

[۲۴۹] کحالہ : معجم المؤلفین : ۶ : ۱۰۶

[۲۵۰] الداودی : طبقات المفسرین : ۱ : ۲۴۴ مطبوعہ شام ۱۳۹۲ھ

جمع کرکے اپنے گھر میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بنا لیا تھا اور انہی کتب میں دن رات گم رہتے۔ سوائے اوقاتِ نماز کے گھر سے باہر نہ نکلتے۔ اِس پر بعض احباب معترض ہوئے تو آپ نے کہا کہ مَیں صحابۂ کرام رض اور تابعین کی صحبت میں چلا جاتا ہوں۔ احباب نے حیرانگی سے پوچھا کہ ان کی صحبت میں کیسے ؟ آپ نے فرمایا : مَیں گھر جا کر ان کی کتب میں غور و خوض کرکے اپنے ماحول کے پیدا شدہ مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے میں لگا رہتا ہوں۔ یہ آپ کا پہلا مرحلہ تھا جس میں آپ نے کتب خرید کر گھر میں جمع کیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ لہو و لعب کی زندگی سے جب پلٹے تو والد ماجد نے پچاس ہزار درہم دیئے کہ تجارت کریں۔ لیکن آپ نے وہ ساری رقوم حدیث کی کتابوں کے خریدنے میں لگا دی۔ اس کے بعد آپ نے طویل سفر کیے جس میں تجارت اور جہاد کے سفر بھی تھے۔ لیکن سب سے زیادہ آپ کے سفر طلبِ علمِ حدیث کے تھے۔

احمد بن حنبل رح فرماتے ہیں۔ [۲۵۱]

" لکم یکن فی زمانہ اطلب	آپ کے دور زندگی میں آپ سے
للعلم منہ جمع امرا	بڑھ کر کوئی طالب علم نہیں تھا۔
عظیماً وکان رجلا	آپ نے علم کا بہت بڑا سرمایہ
صاحب حدیث حافظا	اکٹھا کیا۔ آپ صاحبِ حدیث تھے
وکان یحدث من	اور حافظ تھے۔ آپ کتاب سے
کتاب " ۔	حدیث کی روایت کیا کرتے تھے۔

شعبہ فرمایا کرتے تھے [۲۵۲]

" ما قدم علینا مثلہ — ہمارے پاس ان جیسا کوئی نہیں آیا۔

ابو اسامہ فرماتے تھے [۲۵۳]

" ما رایت اطلب العلم
من ابن المبارک "

---

۲۵۱ ابن العماد الحنبلی : شذرات الذہب : ۱ : ۲۹۵

۲۵۲ ایضاً

۲۵۳ عبدالحئی لکھنوی : فوائد البہیہ : ۱۰۳ : مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

اسود بن سالم فرماتے ہیں [۲۵۴]

كان ابن المبارك امام يقتدى به وهو من اثبت الناس في السنة۔	حضرت عبد اللہ بن مبارک قابل اقتدار امام تھے۔ اور آپ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں دوسرے لوگوں کے سے سب سے زیادہ سند مانے جاتے تھے۔

ابنِ سعد لکھتے ہیں [۲۵۵]

كان ثقة مامونا حجة كثير الحديث	آپ ثقہ قابلِ اعتبار اور کثیر الحدیث تھے۔

مندرجہ بالا روایات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آپ علوم حدیث سے کس حد تک وابستہ تھے۔ آپ نے حدیث کی تلاش و تحصیل میں کیا کیا جتن کیے۔ اور پھر اس حدیث کی جانچ اور روایت میں آپ کے پیمانے کون سے تھے۔ ذیل میں علومِ حدیث اور آپ کی شخصیت کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

حفظِ حدیث

حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ پر اللہ تعالٰے نے جو گراں بہا نعمتیں نچھاور کی تھیں ان میں سے ایک حافظہ تھا۔ آپ جو چیز سُن لیتے فوراً یاد ہو جاتی اور پھر اسے ہمیشہ یاد رکھتے۔ لیکن اس پائے کے حافظہ کے باوجود آپ علم کو کتابی صورت میں رکھتے اور پڑھاتے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں :۔

ماكان احد اقل سقطا منه كان رجلا صاحب حديث حافظ وكان يحدث من كتاب [۲۵۶]	آپ سے بڑھ کر کوئی کم چھوڑنے والا نہیں تھا۔ آپ صاحبِ حدیث حافظ تھے۔ آپ کتاب کو دیکھ کر حدیث بیان کرتے۔

---

۲۵۴ نووی : تہذیب الاسماء واللغات : ۱ : ۲۸۵ : مطبوعہ دمشق

۲۵۵ ابنِ سعد : طبقات الکبریٰ : ۷ : ۳۷۲ : مطبوعہ بیروت ۱۳۷۷ھ

۲۵۶ ابنِ حجر : تہذیب التہذیب : ۵ : ۳۸۴ : دائرہ معارف نظامیہ دکن ہند ۱۳۲۶

اسی طرح حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں [۲۵۷]

"کان موصوفا بالحفظ" یعنی آپ حافظ سے متصف تھے۔

ابراہیم بن عبداللہ بن جنید فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ یحیٰی بن معین سے ایک آدمی نے کہا کہ عبداللہ بن مبارک حافظ نہیں تھے۔ تو حضرت یحیٰی بن معین فرمانے لگے:

کان عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کیساً مستثبتاً ثقۃ، کان عالماً صحیح الحدیث وکانت کتبہ التی حدث سبھا عشرین الفاً او واحد او عشرین الفاً [۲۵۸]	یعنی حضرت عبداللہ بن مبارک ایک ذکی، مسلّم ثبت الرائے اور ثقہ تھے آپ صحیح الحدیث عالم تھے۔ وہ کتابیں جن سے آپ نے حدیث بیان کی ان کی تعداد بیس ہزار یا اکیس ہزار تھی۔

ذہبی لکھتے ہیں:

عبداللہ بن مبارک بن واضح الامام الحافظ، العلام شیخ الاسلام، فخر المجاہدین و قدوۃ الزاہدین [۲۵۹]	عبداللہ بن مبارک (جو) امام، حافظ، علّامہ، شیخ الاسلام فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین (ہیں)۔

آپ کے گھر میں ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ سارا سارا دن اور رات انہی کے مطالعہ میں گم رہتے۔ والد ماجد کو یہ دیکھ کر بڑا غصہ ہوئے۔ آپ نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ یہ ذخیرہ کتب، اگر یہی حالت رہی تو جلا دوں گا۔ حضرت عبداللہ نے جواب دیا۔ "ابا جان! یہ تو جلا کے ختم کر لو گے۔ لیکن وہ علم جو میرے سینے میں محفوظ

---

[۲۵۷] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ: ۱۰: ۱۷۷: مطبوعہ بیروت ۱۹۶۶ء

[۲۵۸] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۱۰: ۱۶۴: مطبوعہ مصر ۱۹۳۱ء

[۲۵۹] ذہبی: تذکرۃ الحفاظ: ۱: ۲۵۳

ہے وہ تو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ [۲۶۰]

نصر بن مساور فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ کیا آپ حدیث حفظ کرتے ہیں۔ آپ کا سوال سُن کر رنگ بدل گیا اور فرمایا: مَیں حدیث یاد نہیں کرتا بلکہ کتاب لے کر اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ جو کچھ چاہتا ہوں وہ میرے دل کے اندر پیوست ہو جاتا ہے۔ [۲۶۱]

ایک اور روایت میں آپ کے دوست صخر فرماتے ہیں کہ ہم کتاب خریدنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مَیں اور عبداللہ بن مبارک بازار سے گزرے تو ایک آدمی خطبہ دے رہا تھا اس کا خطبہ کافی لمبا تھا۔ جب وہ خطبہ سے فارغ ہو گیا تو مجھے ابن المبارک فرمانے لگے کہ مَیں نے اسے یاد کر لیا ہے۔ ایک آدمی کو تعجب ہُوا تو اس نے سُنانے کے لیے کہا۔ آپ نے فرمایا سلو! چنانچہ آپ نے لوگوں پر ساری تقریر دہرا دی جو کہ آپ کو پوری کی پوری یاد تھی۔ [۲۶۲]

اسماعیل بن علی روایت کرتے ہیں۔ [۲۶۳]

بلغني عن ابن المبارك	ابن المبارک سے مجھے پتہ چلا کہ
انه صغر عنده حماد بن	وہ حماد بن زید کے ہاں حاضر
زيد مسلماً عليه فقال	ہوئے۔ سلام کیا۔ حماد بن زید
اصحاب الحديث لحماد	سے حدیث پڑھنے والے طلبہ نے
بن زيد : يا ابا اسماعيل	کہا۔ ابو عبدالرحمن سے کہیں کہ
احدث لنا ابا عبدالرحمٰن	وہ ہمیں حدیث بیان کریں تو حماد بن
ان يحدثنا ؟ فقال يا ابا	زید نے کہا ابو عبدالرحمٰن آپ حدیث
عبدالرحمٰن تحدثهم	بیان کریں ان لوگوں نے خواہش کا
فانهم قد سألوني	اظہار کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن

۲۶۰ھ خطیب بغدادی : تاریخ بغداد : ۱۰ : ۱۶۶ : مطبوعہ مصر ۱۹۳۱ء

۲۶۱ھ ایضاً صفحہ نمبر ۱۶۵

۲۶۲ھ 〃

۲۶۳ھ 〃 تاریخ بغداد : ۱۰ : ۱۵۵ : مطبوعہ مصر ۱۳۴۹ھ

قال : سبحان الله یا ابا اسماعیل، احدث وانت حاضر! قال فقال اقسمت لتفعلن - او نحوہ - قال فقال ابن المبارک خذو، حدثنا ابو اسماعیل حماد بن زید، فما حدث بحرف الاعن حماد بن زید -	مبارک فرمانے لگے : اے ابواسماعیل سبحان اللہ آپ کی موجودگی میں حدیث بیان کروں! حماد بن زید نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ تو حدیث بیان کرے گا - (یا اسی قسم کے الفاظ بیان کیے) کہتے ہیں پھر عبداللہ بن مبارک نے کہا تو پھر سنو! حدثنا ابو اسماعیل حماد بن زید - اور اس طرح کسی حدیث کا کوئی حرف بھی نہ بیان کیا مگر حماد بن زید کی سند سے

روایت بالا سے جہاں آپ کا حماد بن زید کے لیے احترام ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حدیث سے وابستگی جس کی وجہ سے انہوں نے مطالبہ کیا کہ وہ حدیث بیان کریں جبکہ ان کے اپنے استاد موجود تھے۔ وہاں آپ کے حافظہ کا بھی کھلا ثبوت ملتا ہے کہ آپ نے حماد بن زید کی سند سے ان کی موجودگی میں کئی احادیث بیان کیں اور کسی قسم کی سند سے یا حدیث کے الفاظ میں کوئی غلطی نہ کی۔

اسی طرح حسن بن شقیق نے جب عشا کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد کے دروازے پر کسی حدیث کے بارے استفسار کیا تو آپ اس حدیث کے بارے میں فجر کی اذان تک کھڑے بات کرتے رہے۔ یہ روایت جہاں آپ کی وسعت علمی، شوق و دلچسپی کا ثبوت ہے وہاں آپ کے اس حافظہ پر دلالت کرتی ہے جس کے ساتھ آپ نے اتنے وقت تک مختلف احادیث و روایات اپنی بات چیت میں بیان کیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر آپ حدیث کے معاملے میں جاہل ہوتے تو دیر تک بات ہوتی نہ حسن بن شقیق اتنی دیر تک آپ کی بات سنتے رہتے۔ ضرور اس دوران علم میں اضافہ ہوتا رہا اور بات سند اور صحت کے ساتھ ہوتی رہی جس نے انہیں رات کے گزرنے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے :

ان اولا العلم النیۃ　　　یقیناً (علم کی تحصیل میں) سب سے

ثم الفهم ثم العمل	نیت پھر اس کا ادراک، پھر اس
ثم الحفظ ثم النشر[۲۶۴]	پر عمل، پھر اس کا حفظ اور پھر اس کی
	اشاعت ہے۔

آپ کی زندگی اس قول کی تفسیر تھی۔ روایات گذشتہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تحصیل علم کی نیت اور شوق تھا جس کی وجہ سے رات دن کتابوں میں محو رہتے۔ پھر آثار و روایات پر غور کر کے اپنے حالات و واقعات کے ساتھ موازنہ کر کے اس کے صحیح اطلاق کے لیے ادراک حاصل کرتے۔ اس شدت لگاؤ کے بعد وہ خود بخود آپ کے قلب میں راسخ ہو جاتیں جس سے وہ پھر قلب و نظر میں سما جاتیں کہ ان کے بھولنے کا اندیشہ تک نہ ہوتا۔ اس حافظہ کے باوجود علم کی اشاعت کے لیے یہ ضروری سمجھتے کہ اسے تحریری طور پر محفوظ کر لیا جائے۔ کیونکہ حافظہ پھر بھی غیر یقینی حالات سے دوچار کر سکتا ہے۔ لیکن تحریری مواد بہر حال ثبوت کی صورت میں زیادہ قابل یقین ہوتا ہے۔ انہی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ دُور تک پھیلا کر علم کی اشاعت میں بھی اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے بھی تحریری مواد زیادہ مفید رہتا۔ چنانچہ آپ نے بیس یا اکیس ہزار تک کتابوں کی صورت میں علم محفوظ کیا اور انہی سے پھر آگے روایت کیا جیسا کہ امام بخاری کی ایک روایت میں یہ بات پہلے گذر چکی ہے۔

(جاری ہے)

---

۲۶۴ ابراہیم بن علی ابن فرحون المدنی : دیباج المذہب : ۱۳۱ : مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۱ھ

بقیہ : اسلام میں مقاصد تعلیم

دوم - نصاب تعلیم و تربیت میں کتاب و سنت کی تعلیمات کو مرکزی و محوری حیثیت دی جائے انہیں مغرب فکر و فلسفہ کی ذیلی کی حیثیت حاصل نہ ہو۔

سوم - تربیت اساتذہ پر مامور معلّمین کے انتخاب میں جہاں انکی فنی مہارت، علمی قابلیت محنت اور جانفشانی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں ان کے خود تزکیہ نفس پر عمل پیرا ہونے اور اسوۂ حسنہ کو عملی طور پر اپنانے کی بھی لازمی شرط قرار دی جائے۔

مضاربت اور بلاسود بنکاری

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

موجودہ حکومت نے ملک عزیز سے تین سال کی مدت میں، سود کی لعنت ختم کرنے کا جو تاریخی فیصلہ کیا ہے، اسلام کے نظام معاشیات پر اس کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہونگے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو یا انگریزی میں کوئی معیاری کتاب نہیں بلکہ سارا مواد عربی زبان کی قدیم کتابوں میں بکھرا ہوا ہے۔ قیام پاکستان سے ہی کافی عرصہ پہلے، ملک عزیز میں اسلامی نظام کے نفاذ کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی کتاب مرتب نہیں کی گئی کہ جس کی روشنی میں سود کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک ہر طرف سرمایہ داری نظام ہی کا بول بالا ہے جس کی بنیاد سود پر قائم ہے اور جسے اسلام نے سب سے زیادہ سنگین گناہ بلکہ جرم قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم نے تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ بغاوت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ	سود تمہارا لوگوں پر باقی ہے اسے چھوڑ دو
فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ	اگر تم ایمان رکھتے ہو اور اگر تم نے ایسا
مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۔	نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ
(سورۃ البقرۃ، آیت ۲۷۹)	کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

اس لئے یہ فطرتی امر تھا کہ ملک عزیز میں اسلام کا مالیاتی نظام نافذ کرنے سے پہلے اس لعنت کو ختم کیا جائے اور اس سلسلے میں کچھ عملی اقدامات کئے بھی جا چکے ہیں۔

بنکاری نظام سے سود کی لعنت ختم کرنے کے لئے حکومت نے ماہرین کا ایک پینل مقرر کیا تھا جس نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔ اس رپورٹ میں بینکاری نظام کو سود کے بغیر چلانے کے لئے دس عدد تجاویز پیش کی گئیں۔ ان میں سے

ایک تجویز میں فقہ کی ایک اصطلاح "مضاربت" کے حوالے سے سودی نظام ختم کرنے کی سفارش کی گئی تھی جسے بعد میں بینکوں نے اپنا لیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پینل کے معزز ارکان کے سامنے مضاربت کی صحیح تعریف نہ تھی اور انہوں نے اس کی سُنی سنائی تعریف یعنی نفع و نقصان میں شرکت پر اپنی سفارش کی تفصیلات مرتب کیں۔ مضاربت کی اس تعریف سے سود کا خاتمہ نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے جواز کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ حالانکہ یہ ایسی برائی تھی کہ شریعتِ اسلامی نے ایسے معاملات کو بھی ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا کہ جن میں سود کا معمولی سا شائبہ بھی پایا جائے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-

ان اٰخر ما نزل من القرآن آیۃ الربٰو - وان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربٰوا والریبۃ

(کنز العمال مطبوعہ حیدرآباد دکن جلد دوم صفحہ ۲۳۱)

(ترجمہ) ربٰو (یعنی سود) کی آیت قرآن مجید کی آخری نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وصال ہوگیا اور آپؐ نے ہمارے سامنے سود کی مفصّل تفسیر متعین نہ فرمائی۔ اس لئے تم سود اور جس معاملے میں سود کا شبہ ہو ترک کردو۔

حضرتِ علی کرم اللہ وجہہٗ نے تو اس سے بھی زیادہ احتیاط پر زور دیا۔ آپ نے تمام کاروباری حضرات کے لئے فقہ کی تعلیم لازمی قرار دے دی اور فرمایا:

مَن اتجر بغیر فقہٍ فقد ارتطم فی الربٰو

(نہج البلاغہ جلد سوم صفحہ ۲۴۹ شرح محمد عبدہٗ)

(ترجمہ) جس نے فقہ کے علم کے بغیر تجارت کی سمجھو کہ وہ سود میں ڈوب گیا۔

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت کی اس تعریف کو سامنے رکھا جائے جو فقہ کی مستند کتابوں میں ملتی ہے۔ ان کتابوں میں اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

ھی فی اللغۃ عبارۃ عن ان یدفع شخصٌ مالاً لِاٰخر لیتجر فیہ علی ان یکون الربح بینھما علی ما شرطا و الخسارۃ علی صاحب المال۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۴۲)

(ترجمہ) یعنی لغت میں مضاربت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اس شرط

پر تجارت کرنے کے لئے مال دے کر نفع تو بقدر حصّہ ان میں تقسیم ہوگا لیکن نقصان کا ذمّہ دار صرف صاحب مال ہوگا۔

اگر تھوڑے سے غور و فکر سے کام لیا جائے تو مضاربت کا مسئلہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ کوئی کام کرنے والا صرف اسی صورت میں کسی صاحب سرمایہ سے سرمایہ لے کر کام کرتا ہے کہ جب خود اس کے اپنے پاس کچھ نہ ہو۔ اب جب سرمایہ اس کے پاس تھا ہی نہیں تو نقصان کی صورت میں وہ اس کی تلافی کہاں سے کرے گا۔ شریعت نے اس پہلو کا خاص خیال رکھا ہے اور نقصان کا ذمہ دار صاحب سرمایہ کو قرار دیا ہے

مضاربت کی یہ تعریف ایسی متفق علیہ ہے کہ اس پر اُمّتِ مسلمہ کے تمام فقہاء کا اتفاق ہے شیعہ فقہاء بھی اس کی یہی تعریف بیان کرتے ہیں۔ علّامہ ابوالحسن مضاربت کی تشریح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الربح بینھما والوضیعۃ علی المال۔

(الاستبصار فیما اختلف من الاخبار للطوسی جلد سوم صـ ۱۲۶)

(ترجمہ) یعنی نفع میں تو دونوں شریک ہوں گے لیکن نقصان صرف مال کا ہوگا

یہی نہیں بلکہ مضاربت کے کاروبار میں شریک کام کرنے والے حصّہ دار کے اخراجات بھی اسی سرمایہ سے پورے کئے جائیں گے اور ان اخراجات کے بعد جو نفع ہوگا وہ معاہدے کے مطابق دونوں حصّہ داروں میں تقسیم ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

ونفقۃ العامل من المال فی سفرہ من طعامہ وکسوتہ وما یصلحہٗ بالمعروف لقدر المال

(تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالک جلد دوم صفحہ ۸۸ مطبوعہ مصر)

(ترجمہ) کام کرنے والے حصّہ دار کا سفر خرچ مثلاً کھانا کپڑے اور دوسری معروف چیزیں، سرمایہ سے اس کی مقدار کو سامنے رکھتے ہوئے لی جائیں گی۔

یعنی ان اخراجات کے بعد اگر نفع ہوگا، تو حصّہ کے مطابق دونوں حصّہ داروں میں تقسیم ہوگا لیکن اگر خدانخواستہ کاروبار میں نقصان ہوگا تو کام کرنے والا حصّہ دار اس کے پورا کرنے کا ذمّہ دار نہیں وہ نقصان صاحب مال کو برداشت کرنا ہوگا

پھر یہ بھی خیال رہے کہ مضاربت کوئی عام اسلامی حکم نہیں تھا بلکہ اس کی اجازت بعض مخصوص صورتوں میں تھی۔ حنفی فقہ کے مشہور امام شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں:

إن بالناس حاجة إلى عقد المضاربة، فصاحب المال قد يكون عاجزا عن التصرف بنفسه (المبسوط جلد ۲۲ صفحہ ۱۹)

لوگوں کو مضاربت کے اصول پر کام کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ صاحب مال شخص خود اپنے مال سے کام کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔

اسی وجہ سے ظاہری مذہب کے مشہور امام ابن حزم نے مضاربت کی شرعی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اب اگر مضاربت کی مذکورہ بالا تعریف کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دور میں اس پر عمل کرنا آسان کام نہیں۔ ہمارے معاشرے میں کاروبار میں بد دیانت طریقے اختیار کرنا ایک عام اصول بن چکا ہے۔ بالخصوص لوگ تو پہلے ہی بینکوں سے لیا ہوا سرمایہ واپس نہیں کرتے اور جب تمام نقصان کا ذمہ دار صاحب سرمایہ ہوگا تو مضاربت کے تمام کاروبار نقصان پر ہی ختم ہوں گے اور بینکوں کے لئے اپنی اصل رقم واپس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔

بلاسود بینکاری

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مضاربت کے اصول پر بلاسود بینکاری نظام اپنایا نہیں جا سکتا تو اس بارے میں شریعت اسلامی ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے۔ اس بارے میں شرعی احکامات اس قدر واضح اور قابل عمل ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ صدیوں تک اس پر عمل ہوتا رہا ہے اور آج بھی ان پڑھ مسلمان بھی اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن بدقسمتی سے موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے کی وجہ سے اس بارے میں اسلامی تعلیمات سے پہلو تہی کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے شریعت اسلامی نے قرض حسنہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی خوبصورت قرض۔ یعنی ایسا قرض کہ جس کے بدلے میں کسی قسم کا کوئی نفع نہ لیا جائے۔ اس قرضہ حسنہ کے بینکاری کے اصول بھی قرآن حکیم میں بڑے واضح الفاظ میں بیان کر دیئے گئے۔ سورۂ بقرہ کا آخری رکوع انہی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم صرف آیات ۲۸۲ اور ۲۸۳ کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

"اے ایمان لانے والو! جب کسی مقررہ مدت کے لئے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو

تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔
جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ وہ لکھے
اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ، اپنے رب
سے ڈرنا چاہیئے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ اگر قرض لینے والا خود نادان
یا ضعیف ہو، یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے
مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو
عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے
ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔ گواہوں کو جب گواہ بننے کے لئے
کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیئے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کی تعیین کے ساتھ
اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی
بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور تمہارے
شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست
تم لوگ آپس میں کرتے ہو، اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر تجارتی معاملہ طے کرتے
وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جاوے۔ ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔
اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے (آیت ۲۸۲)
اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لئے کوئی کاتب نہ ملے تو رہن بالقبض پر معاملہ
کرو۔ اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ معاملہ کرے۔ تو جس
پر بھروسہ کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ امانت ادا کرے اور اپنے رب سے ڈرے اور شہادت ہرگز
نہ چھپاؤ۔ جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ آلودہ ہے۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر
نہیں۔ (آیت ۲۸۳) (تفہیم القرآن از مولانا مودودی جلد اوّل صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۲)

ان قرآنی احکامات میں بینکنگ کے مشہور بنیادی اصول کی طرح، اس امر کا خاص خیال رکھا
گیا ہے کہ صاحب سرمایہ کا سرمایہ کسی طور ضائع نہ ہو اور اس کے لئے اس دور کے مطابق ممکنہ
احتیاطیں اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہاں تک کہ اگر سفر کی حالت میں قرض کی دستاویز نہ لکھی جا سکے
تو پھر اس قرض کی مالیت کے مطابق مال قرض دینے والے کے پاس رہن رکھا جائے۔ ان قرآنی

تعلیمات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست میں بینک سماجی بہبود کا ایک ادارہ ہے جس میں لوگ اپنی امانتیں رکھیں گے اور ضرورت مندان امانتوں کو قرض حسنہ کی صورت میں فائدہ اٹھا سکیں گے۔ نہ رقم جمع کرانے والا سود لے گا اور نہ ہی قرض حاصل کرنے والے کو کچھ دینا ہوگا۔ جہاں تک بینک کے اخراجات کا تعلق ہے۔ وہ اسی نوعیت کے ہیں کہ جس طرح حکومت تعلیم، زراعت وغیرہ کے شعبوں میں خرچ کرے گی کہ ان اخراجات کا مقصد عوام کی بہبود ہوتا ہے پھر جس طرح انجام کار تعلیم سے قوم کو فائدہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں تعلیم کو کاروبار سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح بلاسود بینکاری سے بھی عامۃ الناس کو فائدہ پہنچے گا۔ چونکہ بنک حکومت کا ایک شعبہ ہوں گے اس لئے حکومت کھاتہ داروں کی جمع شدہ رقم کی ضامن ہوگی۔

آج یہ سود ہی کی لعنت ہے کہ جس نے غریب عوام کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس کی بدولت ہر چیز کی قیمت دوگنا سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ عام استعمال کے کپڑے ہی کو لیجئے کہ عوام تک پہنچتے پہنچتے اس پر آٹھ دس مرحلوں پر سود لگتا ہے۔ پہلے تو کپاس بونے کے لئے سودی قرض کی رقم سے ٹریکٹر کی خریداری ہوتی ہے پھر کھاد کا حصول سودی قرضے کا مرہون منت ہے۔ آڑھتی کپاس کی فصل کے لئے اکثر و بیشتر سودی رقم کا سہارا لیتے ہیں اور جننگ فیکٹری بھی سودی قرضے کی مدد ہی سے اسے آڑھتیوں سے لیتی ہے۔ پھر کپڑے کی ملیں جننگ فیکٹریوں کو سودی قرض کی رقم سے ادائیگی کرتی ہیں۔ پھر مل سے اس کا واحد تھوک فروش اسی اصول کی بنیاد پر کاروبار کرتا ہے مختصر یہ کہ ہمارے پاس پہنچتے پہنچتے اس کپڑے کی قیمت دوتین گنا ہو جاتی ہے۔ اسلامی بینکاری نظام میں ان تمام مرحلوں پر سود کے خاتمے سے یہی کپڑا ایک تہائی نرخ پر دستیاب ہو سکے گا جس کا فائدہ بنکوں میں رقم جمع کرانے والوں کو بھی ہوگا بلکہ اکثر صورتوں میں یہ فائدہ موجودہ شرح سود سے زیادہ ہوگا۔

ہمارے خیال کے مطابق چونکہ بینکاری کا شعبہ بھی اسلامی ریاست کے دوسرے شعبوں کی طرح کا ایک شعبہ ہوگا اس لئے اس کے تمام اخراجات، سرکاری خزانے سے ادا کئے جائیں گے۔ تاہم حکومت کو بھی ان اخراجات سے کئی گنا زیادہ فائدہ ہوگا۔ آج کل حکومتیں اپنے مختلف کاموں کے لئے بینکوں سے بھاری شرح سود پر قرض لیتی ہیں۔ جب سودی نظام ختم ہو کر قرض حسنہ کا نظام جاری ہوگا تو اس کو یہ رقم بغیر سود کے ملے گی اور اس طرح

باقی صفحہ پر

تبصرۂ کتب

نام کتاب : حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ مصنف : پیر غلام دستگیر نامی۔
ناشر : مکتبہ الفاروق سلطان پورہ روڈ لاہور قیمت : چار روپے پچاس پیسے

لاہور میں ایک بزرگ تھے پیر غلام دستگیر نامی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کرام کے ساتھ انہیں جو تعلق خاطر عطا فرمایا تھا، وہ انہی کا حصہ تھا اور قابلِ رشک۔ اس معاملہ میں انہوں نے تحریری سرمایہ بھی تھوڑا جو تھا مت کہتر لیکن بقیمت بہتر کا مصداق ہے اختصار اور جامعیت ان کی خوبی تھی۔ یہی خوبی زیرِ نظر رسالہ میں نظر آتی ہے اس رسالہ میں حضور علیہ السلام کے اس عزیز صحابی کے حالاتِ زندگی، ان کی دینی و ملی خدمات، سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے خاندان و اولاد سے ان کے عزیزانہ و محبانہ تعلقات پر بڑے اچھے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ صحابہ کے معاملہ میں اہلسنت کے عقائد و نظریات کا بھی ذکر کیا گیا ہے تاکہ برادرانِ اہلسنت افراط و تفریط سے بچ کر اپنا فرض ادا کر سکیں۔ ہمارے عزیز دوست حافظ نور محمد انور مستحق تبریک ہیں کہ وہ اپنے "مکتبہ الفاروق سلطان پورہ روڈ لاہور" کے توسط سے ان قدیم شہ پاروں کو شائع کرتے رہتے ہیں ۴/۵۰ روپے کا یہ رسالہ بڑا وقیع اور قیمتی ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

(۲)

نام کتاب : سیرت سیدنا عمرؓ و اصلاحات فاروقی۔ مصنف : مولانا سید نور الحسن بخاری مرحوم
ناشر : مکتبہ الفاروق سلطان پورہ روڈ قیمت : چار روپے پچاس روپے

سیرت سیدنا عمرؓ و اصلاحات فاروقی یہ دوسرا رسالہ بھی محترم حافظ صاحب نے اسی مکتبہ سے شائع کیا ہے جسکی قیمت بھی ۴/۵۰ ہی ہے جو اس رسالہ کے ظاہری و معنوی حسن کے اعتبار سے بالکل برائے نام ہے اسمیں دو مفصل مضمون ہیں ایک کا تعلق مرادِ نبی سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت و تذکرہ سے ہے تو دوسرے کا تعلق آپ کی ان گرانقدر اصلاحات سے ہے جو آپ کے عظیم اور سنہری دورِ حکومت کا گویا لب لباب اور نچوڑ ہیں آپ کا نظامِ حکومت کیا تھا اسمیں مختلف شعبہ ہائے

حیات میں کیا اصلاحات ہوئیں ،کن سے نئے شعبے منظم ہوئے یہ داستان اس مضمون میں شامل ہے۔ پہلا مضمون مشہور مبلغ و مصنف اور صاحب نظر عالم مولانا سید نور الحسن بخاری مرحوم کا ہے تو دوسرا جناب ابوالرشید محمد حسین انصاری کا ہے دونوں مضمون خلوص سے متین اور شگفتہ انداز میں لکھے گئے ہیں جن کا بکثرت پھیلانا برادران اہلسنت کا ملی فریضہ ہے امید کہ ادھر توجہ ہو گی

(۳)

نام کتاب: ماہ محرم اور موجودہ مسلمان مصنف: حافظ صلاح الدین یوسف

ناشر: ضیاء الحدیث مصطفیٰ آباد، لاہور قیمت: ۹ روپے

ماہ محرم اور موجودہ مسلمان - یہ ۸۰ صفحات کا صاف ستھرا اور خوبصورتی کے ساتھ چھپا ہوا رسالہ مشہور دینی ہفت روزہ "الاعتصام" کے ایڈیٹر جناب حافظ صلاح الدین یوسف کے قلم سے ہے جسے موصوف نے بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ ماہ محرم ہمارے ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے جسکی دسویں تاریخ خاص طور پر بوجوہ بڑی اہم ہے جسکا ذکر روایات میں آتا ہے لیکن بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ شیعہ اسکول نے ۶۱ھ کے واقعہ کربلا کے بعد اس پورے مہینہ اور خاص طور پر ابتدائی دس ایام کو نالہ و شیون کے ایام بنا لیا اور پھر مزید جو بدعات ،خرافات اور شرکیہ رسوم پھیلیں انہوں نے معاشرہ کی دینی جڑیں ہلا دی ہیں افسوس کہ برادرانِ اہلسنت کا بڑا طبقہ ان قباحتوں کا شکار ہو گیا اور انہوں نے مطلق نہ سوچا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور آیا یہ باتیں صحیح ہیں یا غلط؟ حافظ صاحب نے تحقیق کا حق تو ادا کیا ہی ہے ،ساتھ ہی ساتھ دل سوزی اور نصیحت و ہمدردی کے جذبہ سے بھی کام لیا ہے تاکہ عزیزان ملت اپنی اصلاح کا کام کر سکیں ۹ روپے میں یہ رسالہ "ضیاء الحدیث مصطفیٰ آباد (دھرم پورہ) لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے اسکی اشاعت وقت کا اہم فریضہ ہے۔

(۴)

نام کتاب: چند غلط فہمیوں کا ازالہ مصنف: حافظ صلاح الدین یوسف

ناشر: دارالدعوۃ السلفیہ ،شیش محل روڈ لاہور۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ۔ یہ رسالہ بھی حافظ صلاح الدین صاحب کے قلم سے ہے جو "دارالدعوۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور" سے حاصل کیا جا سکتا ہے اس کا پورا نام ہے "اسلامی خلفاء و ملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ" قارئین سمجھ گئے ہوں گے ہمارے مخالفین سے بڑھکر "انہوں" نے تاریخ

پر جو ظلم ڈھایا اور مسلم حکمرانوں کی درگت بنائی، اس کے نتیجہ میں ایک عام مسلمان سوچنے لگا ہے کہ ہماری تاریخ شاید ظلم و زیادتی، فتنہ و فساد کی تاریخ ہے۔ شروع کے چند سال شاید بہتر حال میں گذرے ہوں لیکن یہ تمام تر مغالطہ ہے اور اسے مسخ کر دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم حکمران اور سلاطین و امراء نے اپنے اپنے دور میں شاندار درجہ بلند ملی و دینی خدمات سر انجام دی ہیں جو ہمارے حسین ماضی کا حصہ ہیں۔ حافظ صاحب نے تاریخ کے چہرے سے اس گرد کو جھاڑنے کی کامیاب کوشش کی جو اس پر ڈال دی گئی۔ اس رسالہ کو پڑھ کر عزیزان ملت کے دل میں خوشی و مسرت کے ساتھ خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگا اور انہیں اپنے ماضی کے معاملہ میں اطمینان کی کیفیت نصیب ہوگی۔

(۵)

نام کتاب: حالات و مکتوبات مولانا تاج محمود — مصنف: زاہد منیر عامر

ناشر: ادارہ مطالعہ و تحقیق، ۹۲ اسلام پورہ سرگودھا۔ قیمت: ۲۰/- روپے

حالات و مکتوبات مولانا تاج محمود یہ خوبصورت اور ڈسٹ کور سے مزین کتاب جو ۲۰/- اور ۱۸/- روپے میں "ادارہ مطالعہ تاریخ و تحقیق ۹۲ اسلام پورہ سرگودھا" سے حاصل ہو سکتی ہے، مجلس احرار اسلام اور پھر مجلس تحفظ ختم نبوت کے ایک مخلص، بیدار مغز اور مرنجاں مرنج رہنما مولانا تاج محمود ہزاروی ثم فیصل آبادی کے تذکرہ و خطوط پر مشتمل ہے جسے مولانا کے ایک فیض یافتہ نوجوان طالب علم اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پاکستان کے ہونہار مصنف زاہد منیر عامر نے مرتب کیا ہے۔

زاہد بہت ذہین، سمجھدار اور مخلص نوجوان ہیں۔ چھوٹی عمر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بڑوں جیسے کام کر رہے ہیں، ان کی حسن تربیت میں مولانا تاج محمود کا بڑا حصہ تھا، مولانا مخلص نوجوانوں کی آماجگاہ تھے اور ان کی زندگی کا رخ متعین کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ زاہد کو انہوں نے اسکی خوبیوں کی بناء پر لکھنے پڑھنے کیطرف لگایا اور اس نے اسکا حق ادا کیا۔ یہ کتاب ایک مخلص عالم، بیدار مغز رہنما اور محترم انسان کی زندگی کا حسین مرقع ہے، جسکا مطالعہ بڑوں اور چھوٹوں سبھی کو فائدہ دیگا اور اندازہ ہوگا کہ دنیا میں عظمت کسطرح حاصل ہوتی ہے۔

ہزارہ کی سنگلاخ وادیوں کا ایک انسان جہد مسلسل کے سبب اس مقام پر پہنچا کہ وقت نے اسے خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ کتاب ہر لائبریری کی ضرورت ہے۔ لاہور میں سنی پبلی کیشنز اردو بازار سے حاصل کریں۔

(۶)

کتاب: بائبل، قرآن اور سائنس   مصنف: موریس بوکائیے

مترجم: ثناء الحق صدیقی ایم۔اے

قیمت (انگریزی ایڈیشن) :   روپے ' (اردو ایڈیشن) : ۴۰ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۃ القرآن ، اشرف منزل ڈی/۷/۳۴ گارڈن ایسٹ نزد سبیلہ چوک کراچی ۔ ۵

یہ کتاب اصل میں فرانسیسی زبان میں لکھی گئی ۔ بعد ازاں مصنف نے ایک دوسرے اہل قلم "الاستیر دی پانیل" سے مل کر انگریزی میں منتقل کیا جس کے بعد اس کی خوب دھوم ہوئی اور اسے خوب پڑھا گیا ۔ "حقانیتِ اسلام وقرآن" اور "موازنہ ملل" کے لحاظ سے یہ کتاب ایسی ہے جس میں توحید کی حقانیت تو ثابت کی ہی گئی ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ تینوں طبقات یعنی یہودی، عیسائی اور مسلمان کے افکار ملی میں موازنہ بھی کیا گیا ہے اور اسلام کی برتری اور عقیدہ توحید کی اصابت روشن کی گئی ہے ۔ مصنف نے عہد نامہ قدیم کے عمومی خاکہ کو تفصیل سے ذکر کرکے توریت اور اسفارِ خمسہ پر تفصیلی نوٹ دیئے ہیں اور پھر عہد نامہ قدیم اور سائنس کا اس طرح موازنہ کیا کہ نتائج و تحقیق نکھر کر سامنے آگئے ۔

دوسرا حصہ اسی طرح اناجیل سے متعلق ہے ۔ اس میں بھی انجیل کے مختلف مجموعوں پر ہی بحث نہیں کی گئی بلکہ اناجیل اور سائنس کا موازنہ کرکے تضادات اور ناممکنات پر مشتمل بیانات کی تفصیل دی گئی اور آخری حصہ قرآن سے متعلق ہے جسے مختلف ابواب میں تقسیم کرکے مختلف علمی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ــــــ مصنف کے بقول :

> "تیسرے حصہ میں ایک مقدس صحیفہ میں سائنس کے غیر معمولی طور پر استعمال کی مثال پیش کی گئی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دنیوی علوم نے قرآن مجید کی ن بعض آیات کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دی ہے جو اس سے پہلے ناقابل فہم اگر نہ تھیں تو معمہ ضرور تھیں ۔ یہ بات ہمارے لئے اس وجہ سے تعجب خیز نہیں رہتی کہ ہمارے علم کے مطابق اسلام کے نقطۂ نظر سے مذہب اور سائنس کی حیثیت ہمیشہ دو جڑواں بہنوں کی سی رہی ہے، شروع ہی سے اسلام نے لوگوں کو حصول علم کی ترغیب دی ہے اور اس کا نتیجہ یہ رہا ہے کہ اسلامی تمدن کے دورِ عروج میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی جس سے نشاۃ ثانیہ سے قبل خود مغرب نے بھی استفادہ کیا ہے ۔

اس خالص علمی کتاب میں تسامحات ہونے لازمی تھے کہ مصنف اسلام کے بنیادی ماخذ

سے بہرطور اس طرح واقف نہیں جس طرح ایک حامل کتاب و سنت ہوتا ہے، ایسے تسامحات کا ترجمہ میں فاضل مترجم نے فٹ نوٹ میں ازالہ کر دیا ہے بلکہ بہت سے قیمتی نوٹس ایسے دیئے ہیں جن سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے ——— آج جبکہ صلیب و ھلال کا مقابلہ صلیبی میدانوں میں نہیں، علمی درسگاہوں میں ہو رہا ہے، یہ کتاب ایک زبردست ہتھیار ہے شیدائیان و فدائیان اسلام کے لئے، اور ان کے اردو دان طبقہ کو ممنون ہونا چاہیئے۔ فاضل مترجم کا جنہوں نے بڑی جانکاہی سے ترجمہ مکمل کیا اور ساتھ ہی ممنون ہونا چاہیئے کہ مولانا نور احمد کا، جنہوں نے انگریزی ایڈیشن کی اشاعت کے ساتھ ہی ترجمہ کا اہتمام کر کے اسے الگ سے بڑی خوبصورتی سے چھاپ دیا۔ یہ دونوں ایڈیشن واجبی قیمت پر دستیاب ہیں اور اہل ذوق قارئین کا مطالعہ لازم!

---

(۷)

بشریت النبیؐ، انوارِ سخن، فضائلِ جمعہ

دو کتابیں، ایک پمفلٹ سامنے ہیں۔ ناشر ہیں حافظ نور محمد انور مالک مکتبہ الفاروق ۱۹۔ سلطانپورہ لاہور۔ ۴۹، بشریت النبیؐ مولانا سید نور الحسن بخاری مرحوم کے قلم کا شاہکار ہے۔ قدیم ظلمتوں کے ربانوں سے لے کر جدید دور کے ظلماتی طبقات تک کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے معاملہ میں جوان کی جنس کے حوالہ سے الجھنیں ہیں، ان کا حل بخاری مرحوم نے اس طرح پیش کیا کہ جس نے پڑھا آنکھیں کھل گئیں اور ذرہ صداقت کو پہچان گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرد مومن کو علم اور قلم دونوں کی طاقت بخشی تھی۔ اس نے ان نعمتوں کی اس طرح قدر کی کہ "حقائق" کے لکھنے میں عمر گذار دی، اب وہ دنیا میں نہیں لیکن اس کی کتابیں بالخصوص یہ صحیفہ اس کی عظیم یادگار ہے۔

- انوار سخن - مالک مکتبہ حافظ نور احمد انور کی پاکیزہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ ان کے منجملہ دیگر غریب الطبع انسان کو رب العزت نے یہ ذوق سلیم بخشا تو اس نے شاہد و شراب کے بجائے پاکیزگی کا راستہ اختیار کیا علامہ خالد محمود، سید نور الحسن بخاری، قریشی دوست محمد اور قاری عبد العزیز شوقی جیسے ارباب علم و فن نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس گلدستہ کی قدر افزائی کی۔ حمد و نعت اور مناقب آل و اصحاب رسول کا یہ ایسا ایمان افروز گلدستہ ہے کہ ہمارے بس میں ہوتا تو اسے کم از کم اردو فاضل کے کورس میں شامل کر دیتے۔ یہاں بے ننگ و نام شعرا کے مجموعے زیر درس ہیں تاکہ ابناء وطن کے عقائد بگڑیں اور ان کے اخلاق کا جنازہ نکلے۔ ——— بہرطور اہل درد و اخلاص کے لئے یہ مجموعہ عظیم ہے اور ایک مخلص و شریف انسان کی ... کاوش کی قدر ان پر لازم۔

تیسرا پمفلٹ نما کتابچہ "جمعہ" جیسی عبادت سے متعلق ہے، دراصل وہ تقریر ہے حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ تعالیٰ سابق مہتمم مدرسہ دیوبند کی جسے بڑی خوبصورتی سے مرتب کیا گیا ہے۔

یہ تینوں چیزیں ۷/۵۰، ۸/ اور ۱/ میں دستیاب ہیں ——— حاصل کریں، پڑھیں، دکھلائیں۔

(۸)

کتاب: **قرآنی معلومات** مرتب: **حافظ نذیر احمد صاحب کرنالوی**

ملنے کا پتہ: حافظ عبدالرشید، مدرسہ خیبیہ کورنگی ۲/۶ مارکیٹ کراچی ۳۱ - قیمت: ... روپے

پاک اکیڈمی، دکان ۱۲ مسجد باب الاسلام آرام باغ کراچی۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جس کے نزول پر چودہ سو سال گذر چکے ہیں اور اس طویل عرصہ میں جہاں کروڑوں انسانوں نے اسے اپنے سینہ میں محفوظ کر کے سعادتِ عظمیٰ حاصل کی وہاں لاتعداد اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنہوں نے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمہ، تفسیر، اس کے علوم پر تحقیقی تصانیف وغیرہ کا کام کیا۔ اس سرمایہ علمی میں ضخیم کتب بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے بھی گویا اللہ کا ہر بندہ اپنی استعداد و ہمت کے مطابق مصروف عمل ہے۔ بعض رسائل ایسے ہیں جو بظاہر مختصر لیکن جامع انداز کے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی یہ رسالہ ہے، فاضل مرتب حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ کے شاگرد اور لائق عالم ہیں۔ ۱۰۰ کے لگ بھگ صفحات میں انہوں نے بہت سی قیمتی باتیں قرآن عزیز کے متعلق جمع کر دی ہیں۔ بڑوں کے لئے بھی یہ رسالہ بے حد مفید ہے۔ لیکن چھوٹوں بچوں کو تو سبقاً پڑھانے کی چیز ہے۔

بقیہ: مضاربت اور بلا سود بنکاری

اسے جو منافع ہوگا وہ اس شعبہ پر اخراجات سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔

سوشلسٹ ممالک جو کسی مذہب پر ایمان نہیں رکھتے ہیں مذکورہ بالا تفصیلات کے ساتھ بینکاری نظام نے بڑے خوشگوار نتائج دیئے ہیں وہاں دوسرے ممالک کی نسبت ضروریات زندگی کی چیزوں کے نرخ، سرمایہ دار ممالک کی نسبت بڑی حد تک کم ہیں۔ اس بارے میں ہم چین کی مثال دیتے ہوئے نہیں تھکتے۔ اس لئے اگر چین میں انہی تفصیلات سے ملتا جلتا بلا سود بینکاری نظام مثبت نتائج دے سکتا ہے تو ایک اسلامی ملک میں اسے کیوں نہیں اختیار کیا جا سکتا۔

بقیہ: حکم و عبر

آئندہ کے سفر پہ رخصت ہونے والا ہوں، اور اس کا عزیز و محبوب صحابی جس کے نام سے ہم صبح و شام دمادم مست قلندر، علی کا پہلا نمبر جیسے کافرانہ اور سوقیانہ سلوگن لاتے ہیں وہ کہتا ہے اور پوری قوت کے ساتھ کہ "دنیا مردار ہے اور اس کی طلب میں اندھے ہو جانے والے کُتّے"!

لیکن آہ! کہ آج حُبّ جاہ کے ساتھ حبِ مال کی بیماری نے ہم میں سے ہر کسی کو "باطنی دق" کا شکار بنا دیا۔ کل کا منصف، اور آج کا منصف، کل کا سپاہی اور آج کا سپاہی، کل کا حکمران اور آج کا حکمران، کل کا تاجر اور آج کا تاجر، کل کا عالم و صوفی اور آج کا عالم و صوفی ——— کیا نسبت ہے؟

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کل عدل و انصاف میں خلافت کی پرواہ نہ تھی، آج سر بازار سودے ہیں، کل کا سپاہی محاذ سے ملنے والی قیمتی اشیاء منہ اندھیرے اپنے چہرہ کو چھپا کر "کمانڈر" کے پاس جمع کراتا اور کمانڈر کی خواہش پر نام نہیں بتاتا، چہرہ نہیں بتاتا کہ اجر و ثواب میں کمی ہو گی ——— آج کا سپاہی مربعوں، کاروبار اور مختلف اشیاء کا شکار ہو کر سرحدات اسلامی کے دفاع و پہرہ کا اجر و ثواب بھول چکا ہے۔

کل کا حکمران تھوڑی ٹوپیاں سی کر روزی کا اہتمام کرتا ہے، آج قومی خزانہ سے تنخواہ نہ لینے کا اعلان کر کے کوٹھی میں اٹھارہ[۱۸] مالی رکھتا اور دسیوں گاڑیوں پر اپنا حق جتلاتا اور دفتر سے گھر تک جانے میں سینکڑوں کا پٹرول پھونک دیتا ہے، اس کی آنکھ سیر نہیں ہوتی، کارخانے پر کارخانے، مربعوں پر مربعے، ایک کے بعد دوسرا منصب! اور وہ کچھ کہ حقائق سامنے آئیں تو صنم ہری ہری کہے۔

کل کا تاجر ابو حنیفہؒ جو کوفہ بازار میں کپڑا فروخت کرتا ہے۔ اس کے ملازم کی بے خیالی سے داغدار کپڑا فروخت ہو جاتا ہے تو گاہک کی تلاش کرتا ہے، نہیں ملتا تو اس دن کی ساری کمائی (صرف ایک تھان کی نہیں) صدقہ کر دیتا ہے اور آج کا تاجر دس گنا منافع، چور بازاری اور خیانت و کم تولنے کا ماہر۔

کل کا صوفی و عالم شہید راہِ علم و عشق اور آج کا عالم و صوفی در اقتدار پر ٹھوکریں کھانے میں سرگرداں!

فیا حسرتا و یا اسفا!

یہ سب ہوسِ دولت و حبّ جاہ کے کرشمے ہیں "حبّ" و "وھن" کی بیماری کے دو اسباب میں سے ایک سبب ہے اور وھن کے مریض رسالت مآبؐ کے بقول سیلاب کا جھاگ ہوتے ہیں اور بس!

دوسرا سبب، جذباتیت ہے، تحمل، بردباری، عالی ظرفی، فقر غیور، بہادرانہ مزاج اور

جُہدِ مسلسل کے جذباتِ صادقہ کی قاتل صرف ایک برائی ہے جس کا نام جذباتیت ہے، گویا ایک الاؤ ہے جو بھڑکتا ہے اور خوبیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے ـــــ جذباتیت جیسی کچھ یہاں ہے، اس پر تبصرہ کی ضرورت ہے نہ اپنے ناتواں قلم میں اس کی ہمت ـــــ چاروں طرف اندھیرا اور تاریکی ہے۔ دلوں پر غفلت کے پردے ہیں تو آنکھیں جیتے جی اندھی ہو چکی ہیں کانوں سے آیاتِ ربانی سن کر دل متاثر ہوتا وہ بہرے ہو چکے' فریاد ہے' تو اے

"اے اللہ! تیرے دروازے پر ـــــ تیرے ایک بندے نے آج کی خرابیوں کے صحیح اسباب کی نشاندہی کی، ہم نے تو اس پر اپنے فہم نارسا کے مطابق خامہ فرسائی کی۔ اے اللہ! تو علیم و خبیر ہے اور جانتا ہے کہ ہماری اس طویل خامہ فرسائی کا سبب محض یہ ہے کہ کوئی ادھر متوجہ ہو کر اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہو ـــــ لیکن اگر ایسا نہیں تو اے اللہ، درخواست ہے اس بندۂ عاجز کی، جو قوت سے محروم ہے، محض تیرا بخشا ہوا قلم ہے کہ اس نے اپنے طور پر ہمت کر ڈالی اسے اس کے حق میں خیر کا ذریعہ بنا کر آخرت کی رسوائی سے بچا لے اور اگر تو کسی دل پر اس سبب سے اثر ڈال دے تو تُو مقلّب القلوب ہے اور تیرے لئے کچھ مشکل نہیں ـــــ"

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا۔ مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں ؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے ـــ

اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں

خود بھی مطالعہ کیجئے اور اسے پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ـــ اور
بعثتِ محمدیؐ کی تمامی و تکمیلِ شان ـــ نیز
انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج ـــ
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ

مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں دو ۲ عظیم تحفے

✲

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی

کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے ✲ اعلیٰ و دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسولؐ

سورۂ احزاب رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر ✲ ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب ✲ محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

[illegible] ۲۱۴۰۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 4 | FEBRUARY 1986 | No. 12

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ